عرض احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جشنِ آزادی یا خود فریبی؟

گزشتہ دنوں ۱۴ راگست کے حوالے سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ۵۹واں یومِ آزادی منایا گیا‘ جسے سرکاری سطح پر ’’جشن اور عید‘‘ کے انداز میں منایا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو ہمیں اللہ تعالیٰ نے آزادی کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا‘ لیکن کیا ۵۸ برس گزرنے کے بعد آج ہم آزاد قوم کہلائے جانے کا حق رکھتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے دین سے بے وفائی کی سزا کے طور پر ہم اپنی آزادی سے بتدریج محروم ہوتے جا رہے ہیں‘ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ہماری آزادی اب سکڑ کر ایک نہایت مختصر گوشے تک محدود ہو چکی ہے۔ ہم کم و بیش پورے طور پر امریکہ کے غلام اور محکوم بن چکے ہیں۔ گویا ایک محکوم قوم کا ’’جشن آزادی‘‘ منانا خود فریبی ہی قرار پائے گا۔ اور یہ خود فریبی شاید ہماری نفسیاتی ضرورت ہے۔ ؏ ’’نہ ہو اگر یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا!‘‘

حکیم الاُمت‘ عہد حاضر کے عظیم ترجمانِ قرآن علامہ اقبال نے درست کہا تھا کہ ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ۱۴ راگست کا دن خود احتسابی کے لیے مخصوص کیا جاتا اور اس میں زعماءِ ملت سر جوڑ کر اس امر کا جائزہ لیتے کہ پچھلے اٹھاون برسوں میں ہم نے اپنی منزل کی جانب کوئی پیش رفت کی ہے یا اپنی اصل منزل یعنی ’’ایک مثالی فلاحی اسلامی ریاست کا قیام‘‘ سے انحراف کے جرم کا ارتکاب کیا ہے؟ ہمیں جائزہ لینا چاہیے تھا کہ ہم بحیثیت مسلمان اپنے ربّ کو راضی کرنے والے راستے پر چل رہے ہیں یا معاملہ اس کے برعکس ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان ۵۸ برسوں میں اپنی اصل منزل کی طرف پیش رفت کرنے اور انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے آزادی پر اللہ کا حق شکر ادا کرنے کی بجائے ناشکری اور انحراف کی راہ کو اختیار کیا ہے اور دین و ایمان کے تقاضے پورے کرنے سے مجرمانہ اعراض کیا ہے۔ اس جرم میں قوم کا ہر طبقہ شریک ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کسی کا جرم زیادہ ہے کسی کا کم‘ لیکن الا ماشاء اللہ

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\arz-september.inp 9/22/2014 4:40 PM PAGE 1 (1,1)

تمام ہی طبقات شریک جرم ہیں۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس جرم کی سزا نعمتِ آزادی سے محرومی کی صورت میں یہ ملی ہے کہ غیروں کی وفاداری کا دم بھرنے کے باوجود آج دنیا میں کہیں بھی دہشت گردی کا کوئی معاملہ ہو اُس کا مجرم ہمیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ اگر ہم حقیقی آزادی کے خواہاں ہیں تو ہمیں قیامِ پاکستان کے وقت اللہ سے کیے گئے وعدے کے مطابق پاکستان کو مثالی اسلامی فلاحی ریاست بنانے کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے‘ وگرنہ شدید اندیشہ ہے کہ اللہ کا قانونِ عذاب ہم پر پورے طور پر لاگو ہو جائے اور ہم رہی سہی آزادی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اعاذنا اللّٰہ من ذلک!!

(مسجد دارالسلام باغ جناح میں ۱۹/اگست ۲۰۰۵ء کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز)

(باقی صفحہ 80 پر)

کلمۂ طیّبہ اور کلمۂ خبیثہ

قرآن حکیم کی دو انتہائی جامع تمثیلیں

از: ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰنِ الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصۡلُہَا ثَابِتٌ
وَّ فَرۡعُہَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَہَا کُلَّ حِیۡنٍۭ بِاِذۡنِ رَبِّہَا ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ
الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۵﴾ وَ مَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیۡثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیۡثَۃِۣ
اجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ مَا لَہَا مِنۡ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ
الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیۡنَ ۟ۙ وَ یَفۡعَلُ
اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ﴿۲۷﴾﴾ (ابرٰھیم)...... صدق اللّٰہ العظیم

’’کیا تم نے غور نہیں کیا کیسے مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی ایک ایسے شجرۂ طیبہ کے مانند جس کی جڑ مضبوطی سے جمی ہوئی ہو‘ اور اُس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں اور وہ اپنا پھل اپنے ربّ کے حکم سے ہمیشہ بھرپور دیتا ہو۔ اور اللہ لوگوں کے لیے ایسی تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کر سکیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک شجرۂ خبیثہ کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اور اسے کوئی ثبات حاصل نہ ہو۔ اللہ اہل ایمان کو قولِ ثابت کے ذریعے دنیا میں بھی ثبات عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ بے راہ کر دیتا ہے ظلم کرنے والوں کو‘ اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔‘‘

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ آسمانی کتابوں میں تمثیلات بکثرت بیان ہوئی

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms22-08 kalmah tayyiba aur kalma.inp 8/22/2014 4:46 PM PAGE 1 (1,1)

ہیں‘ اس لیے کہ ان کے مخاطب تمام انسان ہوتے ہیں جن میں اکثریت ان عوام الناس کی ہوتی ہے جو اعلیٰ علمی حقائق کو علمی اندازِ بیان اور فنی اصطلاحات کے حوالے سے تو نہیں سمجھ سکتے‘ ہاں اگر انہیں عام فہم تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعے بات سمجھائی جائے تو سمجھ لیتے ہیں۔ اسی لیے ان تشبیہوں اور تمثیلوں کا ان کے تمام مشاہدات سے ماخوذ ہونا ضروری ہے۔ تورات میں تمثیلیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام تر احکام و شرائع ہی کا مجموعہ ہے‘ یعنی صرف کتاب و شریعت پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ وہ کُل کی کُل حکمت اور معرفت پر مشتمل ہے‘ اور ظاہر ہے کہ تمثیل کی ضرورت ایسے ہی اعلیٰ اور لطیف علمی حقائق کی وضاحت کے لیے پیش آتی ہے۔ قرآن چونکہ مجموعہ ہے دلائل و براہین‘ احکام و شرائع اور حکمت و معرفت سب کا‘ لہٰذا اس میں تمثیلات کی کثرت اتنی تو نہیں ہے جتنی انجیل میں ہے‘ لیکن جتنی تمثیلیں بھی اس میں وارد ہوئی ہیں وہ سب ہی فصاحت و بلاغت کی معراج کی مصداق ہیں۔ ان ہی میں سے دو تمثیلیں یہ ہیں جو ان آیاتِ مبارکہ میں بیان ہوئیں۔ ایک مثال ہے کلمۂ طیّبہ یعنی کلمۂ توحید کی۔ اور دوسری مثال ہے کلمۂ خبیثہ یعنی کلماتِ شرکیہ کی۔!!

کلمۂ طیبہ یا کلمۂ توحید کی مثال ایک ایسے مثمر درخت کی ہے جس کی جڑیں بھی مضبوط ہوں اور زمین کی گہرائی میں اتری ہوئی ہوں‘ اور شاخیں بھی نہ صرف یہ کہ خوب پھیلی ہوئی ہوں بلکہ بلند بھی اتنی ہوں گویا کہ آسمان کو چھو رہی ہوں۔ واضح رہے کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق درخت کی غذا سے ہے۔ درخت ایک جانب تو زمین سے غذا حاصل کرتا ہے جس کے لیے جڑوں کا مضبوطی کے ساتھ جمے ہونا اور زمین میں گہرا اترے ہونا ضروری ہے۔ دوسری جانب وہ فضا سے بھی غذا حاصل کرتا ہے جس کے لیے اُس کی شاخوں کا چاروں طرف خوب پھیلے ہونا بھی لازمی ہے اور زیادہ سے زیاہ بلند ہونا بھی‘ تاکہ وہ تنازع للبقاء کے اصول کے تحت آس پاس کے درختوں سے بلند تر ہو کر بلا روک ٹوک فضا سے غذا حاصل کر سکے۔ ان ہی دونوں چیزوں پر دار و مدار ہے

اس کے پھل دینے کا۔ غذا اگر وافر بھی مل رہی ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ بھی مل رہی ہو تو ظاہر ہے کہ پھل بھی اچھے سے اچھا اور ہر موسم پر پورا اور بھرپور آئے گا۔

بالکل یہی مثال کلمۂ توحید کی بھی ہے۔ اس کے تغذیہ وتقویت کا معاملہ بھی دو اطراف سے متعلق ہے۔ ایک فطرتِ انسانی سے جو صالح زمین سے مشابہ ہے اور جس کی گہرائیوں میں توحید کے صاف ستھرے سوتے بہہ رہے ہوں' جہاں سے توحید فی العقیدہ' توحید فی العمل اور توحید فی الطلب سب کو غذا ملتی ہے۔ دوسرے آفاقی آیات و شواہد سے' جن پر غور وفکر سے عقلِ انسانی توحید تخلیق اور توحید تدبیر کا سراغ پاتی ہے۔ ان دونوں کو قرآن مجید نے نہایت جامعیت و اختصار کے ساتھ تو ایک آیت میں اس طرح جمع کیا کہ:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

''ہم عنقریب دکھائیں گے انہیں اپنی آیات آفاق میں بھی اور خود ان کے نفوس میں بھی' یہاں تک کہ یہ بات بالکل کھل جائے گی کہ حق وہی ہے!''

اور علیحدہ علیحدہ ان اسالیب میں بیان کیا کہ کہیں تو اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی تلقین فرمائی' از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَفِىْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (الذّٰریٰت) اور چونکہ اس کی صلاحیت واستعداد کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے' لہٰذا یہ مضمون قرآن میں نسبتاً کم ملے گا آیاتِ آفاقی پر دعوتِ تعقل وتفکر کے مقابلے میں' جس کا نہایت کثرت سے اعادہ ہوا ہے' بالخصوص مکی سورتوں میں' اور جس کا نہایت جامع خلاصہ ہے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ میں' جسے ''آیت الآیات'' قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾﴾

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms22-08 kalmah tayyiba aur kalma.inp 8/22/2014 4:46 PM PAGE 2 (1,1)

> ’’یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں‘ اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں‘ اور اُس کشتی میں جو لوگوں کی ضرورت کی چیزیں لے کر دریا میں چلتی ہے‘ اور اُس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا اور اُس کے ذریعے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کیا‘ اور پھیلا دیے اُس میں ہر نوع کے جاندار‘ اور ہواؤں کے چلانے میں اور اُس بادل میں کہ جو آسمان اور زمین کے مابین مامور ہے‘ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں!‘‘

الغرض توحید کا شجرۂ طیبہ بھرپور غذا حاصل کرتا ہے فطرتِ انسانی کی زمین سے بھی اور آیاتِ آفاقی میں غور و فکر سے بھی‘ اور پھر بھرپور پھل لاتا ہے اخلاقِ حسنہ‘ اعمالِ صالحہ اور اعلیٰ سیرت و کردار کا۔ جن کے نمونے ملتے ہیں: انبیاء و صدیقین‘ شہداء و صلحاء اور اتقیاء و ابرار کی سیرتوں اور شخصیتوں میں‘ جو اصل میں ثمرِ طیب ہیں توحید کے کلمۂ طیبہ ہی کے شجرۂ طیبہ کا۔

اس کے برعکس معاملہ ہے مشرکانہ اوہام و عقائد کا‘ کہ اُن کے لیے نہ فطرت انسانی میں کوئی جڑ بنیاد موجود ہے‘ نہ ہی اس وسیع و عریض کائنات کے کسی گوشے سے انہیں کوئی تائید حاصل ہوتی ہے۔ گویا ان کی مثال اس جھاڑ جھنکاڑ کی سی ہے جو زمین پر ایسے ہی پھیل گیا ہو کہ نہ اس کی جڑیں گہرائی میں اتری ہوئی ہوں نہ شاخیں فضا میں بلند ہوں۔ چنانچہ اس میں نہ پھول لگتے ہیں نہ پھل‘ نہ اُس کا کوئی ایسا سایہ ہوتا ہے جس کے تلے کوئی تھکا ماندہ مسافر کسی وقت استراحت کر لے‘ نہ کسی کو کوئی غذا کا سامان ہی اُس سے حاصل ہوتا ہو۔ پھر یہ کہ اسے کوئی ثبات و قرار بھی حاصل نہیں‘ جہاں کسی نے ذرا سا ہاتھ لگایا اُس کی جڑیں زمین سے فوراً جدا ہو گئیں‘ جیسے کہیں اوپر ہی رکھی ہوئی تھیں۔ جبکہ اس کے برعکس ہے معاملہ کلمۂ توحید کے شجرۂ طیبہ کا کہ اسے زمین سے اکھاڑنا آسان نہیں ہوتا۔ گویا جو لوگ فی الواقعہ توحید پر کاربند ہوں اور عقیدۂ توحید ان کے رگ و پے میں واقعتاً سرایت کر گیا ہو‘ ان کو دنیا میں نہ کسی طرح ہراساں کیا جا سکتا ہے نہ خوف زدہ‘ اور نہ رنجیدہ نہ غمگین‘ اس لیے کہ توحید کا تو اصل ہی خوف اور غم دونوں سے نجات ہے۔

ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿۶۲﴾﴾ (یونس)

''آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے حقیقی دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غم واندوہ سے دوچار ہونے والے ہیں۔''

اسی حقیقت کو یہاں ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

﴿ یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ﴾ (ابراھیم:۲۷)

''اللہ توحید کے قولِ ثابت کے ذریعے اہل ایمان کو دنیا میں بھی ثبات واستقلال عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی۔''

واضح رہے کہ یہی لفظ ''تثبیت'' سورۃ الانفال میں وارد ہوا ہے' جہاں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی مدد کے لیے فرشتوں کو بھیجا اس حکم کے ساتھ کہ ﴿فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''قدم جما دو اہل ایمان کے!'' گویا توحید کے کلمۂ طیبہ کی بنا پر جیسے اہل ایمان کے قدم اس دنیا میں معرکۂ حق و باطل میں جمے رہتے ہیں' ایسے ہی میدانِ حشر میں بھی پورے سکون وثبات کے ساتھ جمے رہیں گے' اور پھر جنت میں وہ پھلیں پھولیں گے اپنے ربّ کی رحمتوں اور شفقتوں کے سائے میں۔ اور اس کے برعکس ہے معاملہ مشرکین کا جن کے ضمن میں فرمایا: ﴿وَیُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ﴾ واضح رہے کہ ظلم سے قرآن مجید میں اکثر وبیشتر ''شرک'' مراد ہوتا ہے' ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ''یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے!'' اب ظاہر ہے کہ مشرک کو بھی جس طرح حیاتِ مادّی کے لیے پانی اور ہوا کی ضرورت ہے' اسی طرح ضمیر کے اطمینان کے لیے جھوٹ موٹ کی کسی نہ کسی نیکی کا سہارا ضروری ہے۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ الٹی سیدھی اور جھوٹی سچی نیکیاں وہ بھی اپنے نامۂ اعمال میں جمع کراتے ہیں۔ لیکن ان کے یہ اعمال نتیجہ خیز اور بارآور نہیں ہوتے' اس لیے کہ اُن کی پشت پر توحید یا اخلاص موجود نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسی تمام نیکیاں رائیگاں جاتی ہیں' جیسے کہ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۸ میں تمثیل بیان ہو چکی ہے کہ:

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ma22-08 kalmah tayyiba aur kalma.inp 9/22/2014 4:46 PM PAGE 3 (1,1)

﴿مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ اَعۡمَالُہُمۡ کَرَمَادِ ۣاشۡتَدَّتۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقۡدِرُوۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا عَلٰی شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِیۡدُ ﴿۱۸﴾﴾ (ابرٰھیم)

’’اُن لوگوں کے اعمال کی مثال جنہوں نے اپنے ربّ کا کفر کیا‘ ایسے ہے جیسے راکھ جس پر کسی آندھی والے دن تیز ہوا چلے۔ چنانچہ جو کمائی (بزعمِ خویش) انہوں نے کی ہوگی اس میں سے ان کے پلّے کچھ بھی نہ پڑ سکے گا۔ (ظاہر ہے کہ) یہی گمراہی کی انتہا ہے!‘‘

اس اہم مضمون کے لیے ایسی ہی فصیح و بلیغ تمثیل وہ بھی ہے جو سورۃ النور میں وارد ہوئی:

﴿وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُہُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَۃٍ یَّحۡسَبُہُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ لَمۡ یَجِدۡہُ شَیۡئًا وَّوَجَدَ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ ؕ وَاللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۳۹﴾﴾ (النور)

’’اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی‘ اُن کے اعمال (یعنی نیکیاں) اس سراب کے مانند ہیں جو کسی چٹیل میدان میں ہو‘ اور جسے پیاسا پانی سمجھ رہا ہو۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو اسے کچھ بھی نہ پائے‘ بلکہ وہ پائے وہاں اللہ کو جو اس کا حساب چکا دے۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی!‘‘

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس دردناک انجام سے بچائے اور توحید کی دولت سے سرفراز فرمائے اور خلوص و اخلاص کی نعمت مرحمت فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین oo

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

منبر و محراب

تذکیر بالقرآن

بسلسلۂ خطبہ جمعہ کے عربی متن کا مفہوم (۲)

از: حافظ عاکف سعید

خطبۂ جمعہ کے متذکرہ بالا مسنون کلمات کے بعد کچھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہاں کوئی ایک سورت یا رکوع بھی تلاوت کیا جا سکتا ہے یا کوئی جامع آیت ہونی چاہیے جس میں پورا ایک پیغام موجود ہو۔ یہ خطبہ کا لازمی جزو ہے' اس لیے کہ آنحضورﷺ کا خطبہ تو گھومتا ہی آیاتِ قرآنی کے گرد تھا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو خطبات جمعہ مرتب کیے اور جو بہت مقبول بھی ہوئے' ان میں انہوں نے سورۃ المؤمن کی ۶۰ ویں آیت خصوصیت کے ساتھ شامل کی ہے اور خطباء حضرات عام طور پر اسی کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ بڑی گھمبیر' جامع اور اہم آیت ہے جو ایک اعتبار سے دین کا خلاصہ ہے۔ انفرادی سطح پر ایک شخص کے لیے دین کی راہنمائی کا لبّ لباب بہت جامعیت کے ساتھ اس ایک آیت میں آ گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

☆ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِىْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ: ''اور کہا تمہارے رب نے مجھ کو پکارو' میں تمہاری پکار کو پہنچوں گا۔'' یہ اصل میں بندگی کی بنیاد ہے کہ دعا کی جائے اور صرف اللہ ہی کو پکارا جائے۔ اسی لیے نماز کی ہر رکعت میں ہم اللہ سے یہ قول و قرار اور عہد کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پروردگار! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے' اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے! جس معاملے میں بھی مدد و اعانت کی ضرورت ہو' ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ مفہوم عبادت کا

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\tt.inp 8/22/2014 4:48 PM PAGE 1 (1,1)

لازمی حصہ ہے۔ آنحضورﷺ نے فرمایا کہ ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) یعنی دعا عبادت کا جوہر ہے۔ عبادت کا ایک ظاہر ہوتا ہے' جیسے نماز کی ہیئت میں ایک خاص انداز سے کھڑے ہونا' رکوع وسجود' قعدہ اور جلسہ شامل ہیں' لیکن اس کا مغز اور جوہر اللہ سے التجا کرنا' اس سے مناجات اور اسے پکارنا ہے۔ ایک دوسری حدیث کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ چنانچہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کوئی شخص جب مشکل وقت آئے تو رجوع کس کی طرف کرتا ہے! ظاہری اسباب و وسائل کے حوالے سے بعض اوقات ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا کام فلاں شخص کے ہاتھ میں پھنسا ہوا ہے' چنانچہ اس تک رسائی کے لیے ہم تگ و دو کرتے ہیں ـــــ جبکہ بندگی کا حاصل یہ ہے کہ سب کچھ پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں ہر حال میں اللہ ہی سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہی راستہ کھول سکتا ہے۔ آنحضورﷺ کا فرمان ہے کہ لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے درمیان ہیں' وہ جس طرف چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ اُسی کی ذات مسبّب الاسباب اور مشکل کشا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کر دیا کہ مجھ ہی سے فریاد کرو' میں تمہاری دعا کو سنوں گا۔

دعا کی قبولیت کے بارے میں حدیث میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ قبولیت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اگر دنیا میں دعا کی قبولیت کا خود اللہ تعالیٰ کے ہاں فیصلہ نہ ہو تو وہ ایک انسان کے لیے توشۂ آخرت بن جاتی ہے۔ لیکن بندگی کا حاصل یہی ہے کہ دعا اللہ ہی سے کی جائے' کسی اور کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا جائے۔

☆ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ : ''بے شک جو لوگ میری بندگی سے تکبر کرتے ہیں (اور تکبر کی بنیاد پر مجھ سے دعا نہیں کرتے) تو عنقریب وہ جہنم میں ذلیل و رسوا ہو کر داخل ہوں گے''۔ ان الفاظ میں بڑا اجلال ہے۔ یہ بھی انسان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی ایک کیفیت ہوتی ہے کہ میں اپنے مسائل خود حل کر سکتا ہوں۔ میرے پاس دولت ہے اور میری ایک حیثیت ہے۔ چنانچہ اللہ سے دعا کرنے میں بھی اسے حجاب محسوس ہوتا ہے۔ یہ بے توفیق لوگ ہوتے ہیں۔

خوداعتمادی کا یہ درجہ فرعونیت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے فرعونوں کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن پھر جب انہیں اچانک ہی کوئی ایسی بیماری آ پکڑتی ہے کہ جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا تو پھر ان کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب وقتی طور پر انہیں کچھ حیثیت دے دی تو ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ بندگی کی حقیقت یہی ہے کہ انسان کسی بھی مقام پر پہنچ جائے' اس کا ظاہر اور باطن اللہ کے سامنے سربسجود رہے۔ یہی شان سورۃ الکہف میں ذوالقرنین کے قصے میں بیان ہوئی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے وسائل فراہم کیے تھے لیکن وہ اس مقام پر پہنچ کر بھی رب کے آگے جھکنے والا تھا۔ اس میں تواضع تھی کہ میں اپنی سی کوشش تو کر رہا ہوں لیکن ہوگا وہی جو میرا رب چاہے گا۔ یہ ہے بندگی کا انداز! دوسری انتہا یہ ہے کہ انسان کو کچھ مل جائے تو پھر وہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگے۔

ہونا یہ چاہیے کہ اس آیۂ مبارکہ کے علاوہ خطبہ میں جو آیات پڑھی جائیں' ان کی مناسبت اس موضوع سے ہو جس پر اردو میں خطاب کیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ سورۃ الجمعہ کے آخری رکوع کی تلاوت ہو سکتی ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کی تلاوت بھی کی جاسکتی ہے۔ یہ اس اعتبار سے قرآن مجید کی جامع ترین آیت ہے کہ پورے نظام کو اللہ کی بندگی کے تابع کیا جائے' جبکہ سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ اس حوالے سے اہم ہے کہ ایک فرد کیسے پوری طرح اللہ کا بندہ بنے!

سورۃ الحدید کی اس آیت کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ پورا اجتماعی نظام توحید کے تابع ہو' اسلام کا نظامِ عدل وقسط قائم ہو' اللہ ہی کی الوہیت اور حکمرانی تسلیم کی جائے' آسمانی ہدایت کو اپنی عقل کے اوپر مقدم رکھا جائے' اللہ کے ماننے والے دینِ حق کو قائم کرنے کی ذمہ داری کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ انقلاب کسی اجتماعی نظام کو بدل دینے کا نام ہے۔ انقلابی عمل میں وعظ' نصیحت' تلقین' تعلیم' تبلیغ' یہ سب اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں' اس کا نقطۂ آغاز یہی ہے' لیکن اس کے بعد ایک مرحلہ آتا ہے جہاں طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے انسان

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\tt.inp 8/22/2014 4:48 PM PAGE 2 (1,1)

جھجکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قتل وخون ریزی کوئی اچھی بات نہیں' طاقت اور اسلحہ کا استعمال کوئی مستحسن کام نہیں۔ لیکن قرآن مجید نے اس آیۂ مبارکہ میں اس تلخ حقیقت کو بالکل عریاں انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کی انقلابی آیات میں بلند ترین مقام سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کو حاصل ہے۔ یہ ان آیات میں سے ہے جن سے آج یہود و نصاریٰ بہت زیادہ خائف ہیں۔ ان کا بس چلتا تو کبھی کے اس آیت کو قرآن مجید سے نکال چکے ہوتے (معاذ اللہ)۔ ہر اسلامی ملک کے اندر ان کے جو ایجنٹ بیٹھے ہوئے ہیں' ان کے ذریعے وہ یہ کوشش تو کر رہے ہیں کہ اس مضمون کی آیات کو نصابِ تعلیم سے خارج کرائیں' قرآن سے نکالنے کا امکان تو ہے نہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

☆ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ: ''ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر۔'' جیسے سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا کہ ''اور تمہارا ربّ کہتا ہے'' اسی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کے ساتھ اپنے ایک خاص معاملے کا ذکر فرما رہے ہیں کہ ہم ہی رسولوں کو بیّنات دے کر بھیجتے رہے ہیں۔ بیّنات سے مراد کھلی' واضح' روشن تعلیمات بھی ہیں اور اس کے مفہوم میں معجزات بھی شامل ہیں جن کو دیکھنے سے آنکھیں کھلتی ہیں۔

☆ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ: ''اور ہم (رسولوں کے ساتھ) نازل کرتے رہے ہیں کتاب بھی اور میزان بھی۔'' یہی دو الفاظ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ میں بھی آئے ہیں کہ: ﴿اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ﴾ ''اللہ وہ ہے جس نے نازل فرمائی کتاب حق کے ساتھ' اور میزان بھی''۔ ''میزان'' کے لیے قرآن مجید میں دوسرا لفظ ''دینِ حق'' آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۳' سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصّف کی آیت ۹ میں آنحضورﷺ کے لیے فرمایا گیا کہ: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ ''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین حق دے کر بھیجا۔'' یہاں لفظ ''الکتاب'' کی

جگہ ''الھدیٰ'' آیا' یعنی ہدایتِ کاملہ' مکمل ہدایت' جس سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ ''میزان'' کی جگہ لفظ ''دینِ حق'' ہے۔ دین کو ہم نظامِ عدل وقسط کہیں گے' یعنی وہ قوانین جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں' اُن کے درمیان باہم حقوق وفرائض کی تقسیم بالکل درست اور منصفانہ ہے۔ دین کے تحت انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں گوشے آ جاتے ہیں۔ سچا دین دنیا میں زندگی گزارنے سے متعلق ضابطۂ حیات ہے۔ عدل وانصاف کے اصول اور معاشرے کے لیے درست اقدار کا تعین' جائز وناجائز اور حرام وحلال میں واضح امتیاز قائم کرنا' اسی طرح ظلم واستحصال کرنے والے طبقات کو قرارِ واقعی سزا دینے کا نظام قائم کرنا دراصل دین حق کا اصل موضوع ہے۔

اسی کے لیے لفظ میزان آیا۔ یعنی نظام درحقیقت حقوق وفرائض کے ایک توازن کا نام ہے۔ افراد جب مل کر رہیں گے تو ایک طرف فرد کی آزادی ہے' جبکہ دوسری طرف فرد کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ان کے مابین توازن مطلوب ہے کہ کسی نظام میں میری آزادی اتنی نہ بڑھ جائے کہ دوسرے لوگوں کی آزادی متاثر ہونے لگے۔ ایک خاص طبقے کو حق اتنا زیادہ نہ دیا جائے کہ دوسرے طبقات کا حق غصب ہونے لگے۔ مَرد کو وہ حقوق نہ دے دیے جائیں کہ پھر خواتین کے حقوق متاثر ہوں' یا خواتین کو وہ حقوق نہ دے دیے جائیں کہ مَرد کے حقوق تلف ہوتے ہوں۔ مرد اور عورت اگرچہ ایک ہی جنس کی دو اصناف ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے۔ دونوں کو بالکل برابر حقوق دے دینا بھی غیر فطری ہے۔ اس امر کا تعین کون کرسکتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے اور کس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اس سوال کے جواب کو منطقی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اگر مرد کرے گا تو وہ عورت کے نفسیاتی تقاضوں' جذبات اور میلانِ طبع سے مکمل طور پر واقف نہ ہونے کی وجہ سے لازماً ایک ایسا نظام بنائے گا جس میں مرد کے حقوق زیادہ رکھے جائیں گے۔ اسی طرح عورت کو اگر نظام بنانے کا اختیار مل جائے تو وہ بھی عدل کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر رہے گی۔ چنانچہ ایک ہی ذات ایسی ہے کہ جو عدل وانصاف کے ساتھ دونوں کے فرائض اور حقوق کا صحیح صحیح تعین

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\tt.inp 8/22/2014 4:48 PM PAGE 3 (1,1)

کر سکتی ہے —— اور وہ ہے جس نے ان دونوں کو پیدا کیا۔ سورۂ ق کی آیت ۱۶ میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ج﴾ ''اور ہم نے انسان کو تخلیق کیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس کیا وسوسہ اندازی کرتا ہے۔'' چاہے مرد ہو یا عورت' انسان کی نفسیات کو سب سے بہتر جاننے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے' جو العلیم ہے' جو خالق ہے۔ لہٰذا ایک ایسا میزان یا دین حق جس میں ہر ایک کو اس کا جائز حق ملے' صرف اللہ ہی عطا کر سکتا ہے۔

اسی طرح فرد اور اجتماعیت کے اندر توازن کا معاملہ بھی وہی خالق و مالک ہی طے کر سکتا ہے۔ دنیا میں کہیں تو ملوکیت اور آمریت اپنے پنجے گاڑ لیتی ہے۔ کوئی آمرِ مطلق اقتدار پر مسلط ہو جاتا ہے اور لوگوں کو قطعاً کوئی حقوق حاصل نہیں رہتے۔ نہ انہیں اظہارِ خیال کی اجازت ہوتی ہے' نہ وہ جماعت بنا سکتے ہیں۔ اس طرح کی آمریت اور ملوکیت میں فرد کچلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس معاملہ یہ ہوتا ہے کہ مکمل انفرادی آزادی ہوتی ہے جو آج مغرب میں ہے کہ جو چاہے کرو۔ اسے مادر پدر آزادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرد اور اجتماعیت میں توازن ایک ایسا معاملہ ہے جسے انسان کا خالق و مالک ہی طے کر سکتا ہے۔

انسانی معاشرے میں فرد کی آزادی اور جزا و سزا کے معاملے میں افراط و تفریط ہے۔ اس حوالے سے ایک تصور یہ ہے کہ جس شخص نے جرم کیا' وہ اصل میں ذہنی مریض ہے جسے توجہ کی ضرورت ہے۔ اسے ایک بہتر ماحول فراہم کیا جائے' جہاں اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ چنانچہ جیل کو ایک آسائش گاہ بنا دیا گیا۔ لیکن یہ تجربہ کر کے بھی انسان نے دیکھ لیا کہ جرم پھر بھی کم نہیں ہوئے۔ لہٰذا انسان کا ذہن یا تو ایک انتہا پر جائے گا یا پھر دوسری انتہا پر۔ ان معاملات میں وہ توازن کے راستے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس ضمن میں اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ایک طرف تو مناسب تعلیم اور درست اقدار کو رائج کرنا چاہیے جو کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری اور علماء کا کام ہے' جبکہ دوسری طرف اگر جرم ثابت ہو جائے تو پھر عبرتناک سزا دی جائے۔ اس کے نتیجے میں معاشرہ

بالکل درست ہو جائے گا! ایسا توازن صرف اللہ ہی عطا کر سکتا ہے۔ لہٰذا دین حق وہ ہے جس میں ہر ایک کو اس کا جائز حق ملے اور پھر وہ دوسرے کے حق پر ڈاکہ نہ ڈال سکے۔ اگر وہ ایسا کرے تو قانون کی زد میں آئے اور اس کو قرار واقعی سزا دی جائے' جبکہ جس کے ساتھ ظلم ہوا ہو' اسے انصاف مہیا کیا جائے۔ اسی کا نام میزان ہے۔

الکتاب یعنی آسمانی ہدایت کا اصل حاصل یہ ہے کہ واضح ہو جائے کہ تم کون ہو' تمہارا خالق کون ہے' اس کی صفات کیا ہیں' تمہاری منزل کیا ہے' خیر کیا ہے' شر کیا ہے' حقیقت کیا ہے' شیطنت کیا ہے' شرک کیا ہے' توحید کیا ہے! اس کے ساتھ ساتھ عملی ہدایت کا ایک گوشہ یعنی میزان الگ کر دیا گیا' جو کہ عدل وقسط کا اجتماعی نظام ہے۔ اس کی رُو سے معاشرتی سطح پر سب انسان برابر ہیں۔ بحیثیت انسان کوئی اونچا یا نیچا نہیں ہے بلکہ سب کا خالق ایک اللہ ہے۔ آدم اور حوا کی اولاد ہونے کے ناطے ان سب کے حقوق برابر ہیں۔ پیدائشی طور پر کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں ہے۔ یہ نظام حضرت محمدﷺ نے قائم کر کے دکھایا تھا اور دشمنوں نے بھی گواہی دی کہ واقعتاً جو بات آپؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمائی تھی کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی سرخ رو کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں ہے' تو یہ صرف الفاظ نہیں تھے بلکہ اس بنیاد پر عملاً ایک معاشرہ قائم کر کے دکھایا گیا۔ یہ نظام سماجی اور معاشی ہر سطح پر کامل عدل کا ضامن ہے۔ زندگی کی دوڑ میں ہر ایک کو یکساں مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔ ملکی وسائل اور دولت کو تمام طبقات میں یکساں طور پر گردش کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ دولت سرمایہ داروں کے طبقے ہی سے نکلے اور گھوم پھر کر وہیں لوٹ جائے جبکہ دوسرے تمام طبقات محروم رہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷) یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص کی صلاحیت ایک جیسی نہیں ہے۔ کوئی اس موقع پر فائدہ اٹھائے گا اور آگے نکل جائے گا جبکہ کوئی پیچھے رہے گا' لیکن مواقع تو سب کو یکساں حاصل ہوں۔ یہ معاشی عدل کا تقاضا ہے۔

اسی طرح سیاسی عدل کے لیے ضروری ہے کہ سب کے یکساں حقوق ہوں۔ ہر

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\tt.inp 8/22/2014 4:48 PM PAGE 4 (1,1)

مسلمان دوسرے مسلمان کا کفو (ہم پلہ) ہے۔ اس معنی میں قانونی حق کے اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ اس میں اگر فرق آئے گا تو ایک اسلامی ریاست میں بعض پہلوؤں سے مسلمان اور غیر مسلم کا ہوگا' لیکن مسلمان سب یکساں ہیں۔ اسی طریقے سے یہ بات بہت اہم ہے کہ خلافت کسی کا پیدائشی حق نہیں بلکہ یہ امر المسلمین ہے' یعنی مسلمان مل کر اپنے میں سے ایک خلیفہ کا تعین کریں۔ تمام مسلمانوں کو اس پر یکساں حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے سے کسی کو خلیفہ کے طور پر منتخب کریں۔ کسی ایک طبقے کو پیدائشی طور پر یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کا مستحق ہو کر بیٹھ جائے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہوا سے فوری اور سستا انصاف میسر ہو۔

آیت کا اگلا حصہ بہت اہم ہے۔

☆ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ : ''تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں۔'' بین السطور میں یہ ہے کہ رسولوں کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس دینِ حق اور میزان کو نصب کیا جائے۔ دینِ حق قائم و غالب ہو۔ یہ ''الکتاب'' اللہ نے اس لیے نہیں دی کہ تم اس کو کبھی کبھی پڑھ لیا کرو۔ کسی عزیز' رشتہ دار' دوست کا انتقال ہو گیا تو ایک سپارہ پڑھ لیا اور ایصالِ ثواب کر کے آ گئے۔ یا یہ کہ خود عمل تو کرنا نہیں ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھی ثواب کے لیے پڑھنے میں کیا حرج ہے' آخر ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں تو ملیں گی! الھدیٰ کا صرف یہ مصرف نہیں ہے۔ اللہ نے رسول بھی اس لیے بھیجے' کتاب بھی اس لیے نازل کی اور دین حق بھی اس لیے عطا کیا تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اسی نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ اے نبی! کہہ دیجیے: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (الشوریٰ:۱۵) ''مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں!'' یہ میزانِ عدل اس لیے دی گئی تھی کہ اسے نصب کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت کے موقع پر فرمایا تھا: ''لوگو! تم میں سے جو قوی ہے میرے نزدیک وہ ضعیف ہوگا جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں' اور جو ضعیف ہے

وہ قوی رہے گا جب تک کہ اسے اس کا حق دلا نہ دوں‘‘۔

اس آیت میں رسولوں کو عطا کردہ تین چیزوں (بیّنات‘ کتاب اور میزان) کا جو حاصل بتایا گیا ہے وہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس نظام کے قائم ہونے کے نتیجے میں لوگوں کو ایسا ماحول میسر آئے گا جس میں ان کی روحانی ترقی کے امکانات ہوں گے۔ اگر یہ میزان نصب نہیں ہے تو وہ معاشرہ استحصالی معاشرہ ہے۔ اس کے اندر ظلم ہے‘ چاہے ظاہری طور پر وہ ایک نہایت خوش نما نظام ہو۔

مغرب سے درآمد شدہ جمہوری نظام کی اصلیت کو علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے پہچانا تھا کہ ع چہرہ روشن‘ اندروں چنگیز سے تاریک تر۔ بظاہر تو یہ بڑا عمدہ نظام ہے‘ لیکن جن بنیادوں پر یہ اٹھایا گیا ہے وہ اصل میں چنگیزیت ہے۔ اس نظام میں وہی اوپر آ سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ ہو گا۔ سرمائے کے ذریعے وہ میڈیا کو بھی خرید سکتا ہے۔ لہٰذا بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ہم نے اپنے ووٹ سے ایک شخص کو اوپر پہنچایا ہے لیکن درحقیقت ہمارے ذہن کو آزاد نہیں چھوڑا گیا بلکہ یہ ذرائع ابلاغ سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ جس کے پاس سرمایہ نہیں ہے‘ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس کے مظاہر آج ہم پوری دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔

اسی طرح سودی بنیادوں پر قائم معاشی نظام کو سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے اور ظاہراً یہ بڑا خوشنما نظر آتا ہے‘ لیکن حقیقت کے اعتبار سے بقول اقبال ؎

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

اس سودی نظام کے نتیجہ میں انسان حیوانیت سے اتر کر درندگی کی سطح پر آ جاتا ہے۔ سود خور اصل میں درندے ہیں‘ وہ انسان نہیں رہتے۔ وہ مروّت‘ شرافت‘ رحمت اور شفقت کے جذبات سے قطعاً عاری ہوتے ہیں۔ چاہے اپنے پاس اتنا جمع ہو چکا ہو کہ دس پشتیں کھا سکتی ہوں‘ لیکن اس سود کی بنیاد پر وہ غریبوں کے کپڑے تک بیچنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ قانون امریکہ میں سودی نظام کے علمبردار یہودیوں نے بنایا تھا کہ اگر

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\tt.inp 8/22/2014 4:48 PM PAGE 5 (1,1)

ایک شخص دیوالیہ ہو جاتا ہے تو پھر حکومت اس امر کی پابند ہے کہ ان سود خوروں کو ان تمام واجبات کی ادائیگی کرے جو اس شخص کے ذمہ تھے‘ چاہے اس عمل میں اس کا گھر بھی نیلام ہو جائے۔ اسی طرح یہ جو قسطوں پر چیزیں دی جاتی ہیں‘ ان کی ادائیگی اگر وقت پر نہ ہو تو شرح سود میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس جال میں پھنس کر ہر سال لاکھوں افراد دیوالیہ ہوتے ہیں۔ سود خور چاہتا ہے کہ ہر چیز مجھے مل جائے اور میں اپنا حق وصول کر لوں‘ اور حکومت اسے یہ سب کچھ دلوانے کی پابند ہے۔ ہاں دیوالیہ شخص کو زندہ رہنے کے لیے حکومتی سطح پر کچھ بنیادی ضرورتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ لیکن اس طرح حکومت کنگال ہو جاتی ہے‘ جبکہ سود خوروں کے کھتے بھرتے جاتے ہیں۔ بہرکیف‘ یہ سودی نظام حقیقت کے اعتبار سے چنگیزیت اور ابلیسیت ہے۔

ایسے بدترین استحصالی نظام میں انسان کو اللہ‘ اس کے دین‘ روحانیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا خیال کہاں آئے گا! وہ تو اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی تگ و دو میں لگا رہے گا جبکہ سود خور آگے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں رہیں گے۔ لہٰذا اگر یہ دین حق قائم ہو تو اس کے نتیجے میں انسان اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے اور عبدیت کے تقاضے پورے کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ رسولوں کو اسی لیے بھیجا گیا۔

آیت کے اگلے الفاظ نہایت توجہ طلب ہیں:

☆وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ : یہ وہ الفاظ ہیں جو یہود و نصاریٰ کو بہت چبھتے ہوں گے۔ ’’اور ہم نے لوہا اتارا‘ اس میں جنگ کی بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں‘ اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کون ہیں جو اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں‘ غیب میں رہتے ہوئے۔‘‘

بأس کا ترجمہ بعض حضرات صرف قوت کر دیتے ہیں کہ ’’اس میں بڑی قوت ہے‘‘ لیکن اس کا حقیقی ترجمہ ’’اسلحہ کی قوت‘‘ ہے۔ اسی لوہے سے تلوار‘ نیزہ‘ ڈھال اور دیگر سامانِ جنگ تیار ہوتا ہے‘ توپ اور ٹینک بھی اسی سے بنتے ہیں۔ فولاد کے کچھ اور کام

بھی ہیں اور استعمال کی بہت سی چیزیں اس سے بن سکتی ہیں لیکن اس کا اصل وصف جنگی صلاحیت ہے۔ لوہے کی قوت اس لیے ہے کہ جو طبقات بھی دین حق کے قیام اور اس میزان کو نصب کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنیں' ان کی سرکوبی کے لیے اسے ہاتھ میں لو اور ان کے سر کچل دو۔ اس طرح یہ ثابت کرو کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ کے وفادار ہو۔ رب کی دھرتی پر رب کا نظام قائم کرنے کے لیے میدان میں نکل آؤ۔ یہ ہے اصل ہدف جو مسلمانوں کو دیا گیا! نیو ورلڈ آرڈر تاریخ انسانی کا سب سے بڑا شیطانی نظام ہے اور اس کے پیچھے ٹیکنالوجی کی پوری قوت ہے۔ یہی دجالیت کی انتہا ہے' جس سے ہر نبی اور رسول نے پناہ مانگی ہے۔ لیکن جو لوگ اللہ اور رسولؐ کے وفادار ہیں' ان کی وفاداری کا امتحان یہی ہے کہ وہ نکلیں اور ان طبقات سے نبرد آزما ہوں۔ لوہے کی قوت کو ہاتھ میں لے کر دین حق کے قیام کی ہر رکاوٹ کو دور کریں۔ یہ قرآن مجید کی سب سے بڑی انقلابی آیت ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقِ انقلاب دوٹوک انداز میں بیان فرما دیا گیا ہے کہ ہم نے دلیل اور بیّنہ بھی اتار دی' کتاب بھی نازل کر دی اور میزان بھی اتار دی۔ کتاب کی دعوت سے لوگ آپؐ کے قریب آ جائیں گے۔ لیکن اب ان کو منظّم کر کے ایک طاقت بنانا ہے تاکہ نظامِ باطل سے ٹکرایا جائے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ میزانِ عدل وقسط کو دنیا میں نصب کیا جائے۔ اس آیۂ مبارکہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر کے انقلابی لٹریچر میں اس سے زیادہ عریاں انقلابی الفاظ کہیں نہیں ملتے!

☆اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ: اور ساتھ ہی فرما دیا کہ یہ واضح رہے کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے' زور آور ہے۔'' اس کا اقتدار پوری کائنات اور کون ومکاں کو محیط ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) کوئی کمزوری لاحق ہو گئی ہے اور اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ تو القوی ہے' بڑی قوت والا ہے' العزیز ہے' زبردست ہے۔ کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ وہ بے بس ہو گیا ہے اور تم سے مدد کے لیے

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\tt.inp 8/22/2014 4:48 PM PAGE 6 (1,1)

کہہ رہا ہے۔ اُس کا ایک حرفِ کُنْ آنِ واحد میں یہ نظام تلپٹ کر سکتا ہے‘ لیکن اصل میں تمہارا امتحان پیشِ نظر ہے۔ یہ تمہاری وفاداری کا امتحان ہے۔ ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس امتحان میں کامیابی کی صورت میں وہ نعمتیں اور آسائشیں ملیں گی جن تک کبھی کسی کے تخیل کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس امتحان کے ذریعے اگر دین قائم ہوگا تو نوعِ انسانی کا بھلا ہوگا‘ انہیں عدل وانصاف ملے گا‘ انہیں وہ ماحول میسر آئے گا جس میں وہ انسانیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ترقی دے کر حیوان کی سطح سے بلند ہو سکیں گے۔

ابوداؤد کی ایک روایت کے مطابق آنحضورﷺ اکثر اوقات خطبہ جمعہ میں سورۂ قٓ پڑھا کرتے تھے اور اس کے حوالے سے تذکیر وموعظت فرمایا کرتے تھے۔ اس سورت کا اصل مضمون توحید‘ رسالت اور آخرت کے حوالے سے تذکیر ہے۔ بہرحال اب آگے بڑھتے ہیں۔ تلاوتِ آیات کے بعد پہلے خطبے کے آخر میں یہ دعا ہوتی ہے:

☆ بَارَکَ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ فِی الْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ اللہ تعالیٰ اس قرآن عظیم کے حوالے سے میرے لیے اور آپ سب کے لیے برکت پیدا فرمائے!‘‘ خطبے میں جو آیات ہم نے سنی ہیں اور تذکیر وموعظت حاصل ہوئی ہے‘ اللہ تعالیٰ اس میں ہم سب کے لیے برکت پیدا فرمائے اور اسے ہمارے لیے خیر کا ذریعہ بنا دے۔

☆ وَنَفَعَنِیْ وَاِیَّاکُمْ بِالْاٰیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ: ’’اور یہ آیات اور حکیمانہ ذکر میرے لیے بھی اور آپ سب کے لیے بھی نفع بخش ہو‘‘۔ یعنی اب ہم ان آیات سے فائدہ اٹھائیں اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنائیں تاکہ یہ ہمارے لیے سودمند ثابت ہوں۔ اس کے لیے بھی اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں اس کی توفیق دے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے‘ جو الحکیم ہے یعنی انتہائی حکمت والا! دنیاوی سطح پر بھی بہت سے لوگوں کو حکیم‘ دانا اور صاحب فراست کہا جاتا ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کسی بڑے سے بڑے عالم یا دانشور کی سمجھ بوجھ کا کوئی موازنہ اور تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اپنی زندگی میں

لوگوں کے اقوال اور فلسفۂ حیات پر عمل کرتے ہیں تو یہ اصل میں خود ہماری محرومی ہے۔ قرآن کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے منبع سے حکمت اور دانائی اخذ کرنے کی کوشش کرنا ہماری اپنی کم نصیبی ہے۔

☆اِنَّہٗ تَعَالٰی جَوَّادٌ کَرِیۡمٌ مَلِکٌ بَرٌّ رَّءُ وۡفٌ رَّحِیۡمٌ ''یقیناً اللہ تعالیٰ انتہائی جود و سخا والا' کرم فرمانے والا' بادشاہ' محسن' مہربان' رحم فرمانے والا ہے''۔ اللہ تعالیٰ ایسا سخی ہے کہ جو مانگنے سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں کہ اس سے مانگا جائے اور وہ اس پر راضی ہو۔ ذات باری تعالیٰ انتہائی کرم فرمانے والی ہے۔ وہ کون و مکان اور ارض و سماوات کا بادشاہِ حقیقی ہے۔ جو اس کے وفادار ہیں' وہ ان کی توقعات پر پورا اترنے والا اور انہیں پورا پورا صلہ دینے والا ہے۔ اس پر توکل کرنے والوں کا وہ مولا اور محافظ ہے۔ رأفت اور رحمت کے الفاظ اصل میں اکٹھے آتے ہیں۔ رأفت سے مراد کسی کے دکھ درد کو محسوس کرنا ہے جبکہ رحمت یہ ہے کہ کسی کی تکلیف محسوس کر کے اس کے ازالے کے لیے کوشش کی جائے۔ اس مفہوم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی!

پہلا خطبہ ان الفاظ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خطیب کچھ دیر کے لیے بیٹھتا ہے۔ بعض احادیث کی رو سے دونوں خطبوں کے درمیان یہ چند لمحات دعا کی قبولیت کے حوالے سے نہایت معتبر ہیں۔ لہٰذا اس وقفے کے دوران اپنے اپنے طور پر دعا کرنی چاہیے۔ (جاری ہے)

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

سابق پادری گلزار احمد

اسلام دین فطرت ہے اور ایک قلبِ سلیم کا حامل شخص جب خلوص و اخلاص کے ساتھ طلب ہدایت کے جذبے سے اس کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اسے اپنی فطرت کی پکار سمجھتا ہے اور وہ اس پکار پر لبیک کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سابق پادری گلزار احمد صاحب بھی اسی طرح کے تجربے سے گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو اسلام کے لیے کھول دیا اور انہیں اپنی نعمت ہدایت سے مالا مال کر دیا۔ گلزار احمد صاحب اب قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبہ تحقیق اسلامی میں علمی و تحقیقی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اِن صفحات میں موصوف کے قبولِ اسلام کی داستان بھی بیان کی جا رہی ہے' اور ''شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا'' کے مصداق مسیحی عقائد و نظریات کے بارے میں ان کے مشاہدہ کردہ تضادات بھی نذر قارئین کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

اسلام قبول کرنے کی وجوہات بیان کرنے سے پہلے میں چاہوں گا کہ مختصراً اپنا تعارف کروا دوں۔ میرے والد اگسٹنگ سردار پال ملتان کے ایک پروٹسٹنٹ چرچ میں پادری تھے۔ جب میں پیدا ہوا تو میرا نام گلزار اے پال رکھا گیا۔ میں نے میٹرک' ایف اے اور بی اے کا امتحان ملتان سے پاس کیا' اس کے بعد میں اٹک چلا گیا اور مسیحی مذہبی تعلیمات ''علومِ الٰہیات'' کے گریجوایٹ کورس B.Th کے لیے ''زیڈ بی آئی سیمینری'' میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۲ء میں کوئٹہ کے ''پینٹی کوسٹل چرچ'' میں بطور پادری خدمات سرانجام دینے لگا۔ ایک سال بعد ڈیرہ غازی خان میں مسیحی ادارے ''دی بیسک انفارمیشن فار بائبل'' میں بطور مینیجر میرا تقرر ہو گیا۔ یہاں میں نے چار سال گزارے۔

علومِ الٰہیات (Theology) میں ماسٹر ڈگری (M.Th.) کے لیے میں نے گوجرانوالہ سیمینری میں داخلہ لیا۔ یہاں چونکہ روزانہ حاضری لازمی نہیں تھی' اس لیے میں

E:\Ms-2005\Mesaaq_Pdf_2005\mesaq september05\gulzar ahmad.inp 8/22/2014 4:40 PM PAGE 1 (1,1)

ساتھ ملازمت بھی کرتا رہا۔ ۱۹۸۲ء میں مَیں نے ایم اے اسلامیات کرنے کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۸۴ء میں اسلامیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ (ایم اے اسلامیات کی وجوہات آگے بیان کروں گا) دورانِ تعلیم ہی یعنی ۱۹۸۳ء میں ''سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ چرچ'' کے ایک ذیلی ادارے ''پاکستان ہوم اینڈ ہیلتھ سروس'' کے جریدہ ''ماہنامہ صحت'' کے سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ میں بطور مینیجر کام کرنے لگا۔ M.Th کے تھیسس کے لیے میرا موضوع ''مسیحیت اور دنیا بھر کے مذاہب'' تھا۔ ۱۹۸۳ء میں مَیں نے کوٹ لکھپت (لاہور) کے ایک چرچ میں بطور پادری خدمات انجام دیں۔ پاکستان ایڈونٹسٹ سیمینری فاروق آباد ضلع شیخوپورہ میں چھ سال علومِ الٰہیات کی تدریس کی۔ ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۹۱ء کے دوران میں نے علومِ الٰہیات میں انٹرنیشنل گوسپل یونیورسٹی جرمنی سے ایم فل کیا۔

میری والدہ ایک ہاؤس وائف ہیں اور والد کے ساتھ باقاعدہ گرجا جاتی ہیں۔ ہم سات بہن بھائی ہیں' چار بھائی اور تین بہنیں۔ میں سب سے بڑا ہوں۔ ۱۹۹۲ء میں میری شادی ہوئی۔ میرے دو بچے ہیں' ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔

جہاں تک اِس بات کا تعلق ہے کہ میں نے اسلام کیوں قبول کیا' تو اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب میں چرچ میں پادری تھا تب مسلمان بھی میرے پاس آتے تھے۔ اگرچہ میں اُن کو جوابات تو دیتا تھا تاہم ساتھ یہ بھی سوچتا تھا کہ آخر اسلام ہے کیا؟ اس چیز نے مجھے اسلام کے متعلق مزید علم حاصل کرنے پر ابھارا۔ چنانچہ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا۔ اس کے ساتھ M.Th کے تھیسس میں میرا موضوع تھا: ''مسیحیت اور دنیا بھر کے مذاہب''۔ پھر میں نے ایم فل بھی علوم الٰہیات میں کیا ہوا تھا' ان سب باتوں نے مل کر میرے اندر غور وفکر اور تقابلِ ادیان کا جائزہ لینے کی جستجو اور صلاحیت پیدا کر دی۔ اس کے بعد جہاں مجھے اسلام کو قریب سے جاننے کا موقع ملا وہاں مسیحیت کے اندر پائی جانے والی خامیوں' خلا اور تضادات کا بھی مجھے ادراک ہوا۔ اگر مسیحیت میں پائی جانے والی خامیوں کا مجھے ادراک نہ ہوتا تو شاید میں بھی دوسرے پادریوں کی طرح بدستور مسیحیت سے چمٹا رہتا۔ مسیحیت کے اندر بہت سے حل طلب سوالات اور بہت سے تضادات تھے۔ میں یہ سوالات پادریوں اور مسیحی علماء کے سامنے رکھتا مگر کسی سے بھی مجھے اطمینان بخش جواب نہ ملتا۔ جوابات نہ ملنے کی وجہ سے ایک طرف مسیحیت سے غیر مطمئن ہونے لگا تو دوسری طرف اسلام کی طرف میرا رجحان مزید بڑھتا چلا گیا۔

میں مختلف مسلمان علماء کے پاس جاتا' اُن سے تشنہ سوالات پوچھتا' وہ میری تسلی وتشفی نہ کرتے۔ جب میں علماء سے اسلام اور مسیحیت کے تقابل کا کہتا تو وہ کہتے کہ ایسے موضوع کو زیرِ بحث لانا گناہ ہے۔ میں ان علماء کے نام لینا پسند نہیں کروں گا' ممکن ہے کہ یہ علماء اُس وقت جواب دینے کے موڈ میں نہ ہوں۔ اسی کشش وپنج اور طلب وجستجو میں ایک دن ویگن میں میری ملاقات ایک شخصیت سے ہوگئی۔ وہ شخص حقیقت میں بہت اچھے انسان تھے اور صاحبِ علم بھی۔ ان کے ساتھ غائبانہ تعارف تو پہلے سے تھا لیکن بالمشافہ ملاقات پہلی دفعہ ہوئی اور وہ تھے پروفیسر عبدالجبار شاکر۔ انہوں نے مجھے کہا ''گلزار صاحب! آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ جب بھی کوئی سوال ہو آپ میرے پاس آ جایا کریں!'' یہ احسان ناشناسی ہوگی اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ میرے اسلام قبول کرنے میں پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب کا گہرا عمل دخل اور بہت زیادہ تعاون شامل ہے۔ اس دوران کچھ اور لوگوں نے بھی میری علمی تشفی کی۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ اُن کو جزائے خیر دے۔

۱۹۹۹ء کی بات ہے جب میری ملاقات کرنل بصالت سے ہوئی۔ اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کے بارے میں مَیں نے اُن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ انہوں نے مجھے الازہر یونیورسٹی کے پروفیسر شیخ زید بن مسلم کی لکھی ہوئی کتاب ''المخلصی للاقوام'' کا انگریزی ترجمہ ''The Salvation of Nations'' پڑھنے کو دیا۔ اس کتاب میں غیر مسلموں کے اندر اسلام کے متعلق جو اشکالات اور سوالات اٹھ سکتے ہیں' ان کے جوابات دیے گئے ہیں۔ کتاب میں سات سو سے زائد سوالوں کے جوابات موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے میرے تمام سوالوں کے جوابات اس کتاب میں موجود تھے۔ میں نے یہ کتاب تقریباً دو سال مسلسل پڑھی۔ اگرچہ اس دوران میں نے اسلام قبول نہیں کیا تاہم گھر میں اہلیہ سے گفت وشنید ہوتی رہتی تھی۔ جب ۲۰۰۴ء شروع ہوا تو میں نے اپنی اہلیہ سے بات کی کہ سچائی' صداقت اور حق کی تلاش کا جو سفر میں نے شروع کیا تھا اسے میں نے پا لیا ہے' میں اپنی منزل پر پہنچ چکا ہوں اور میری منزل اسلام ہے۔ میری اہلیہ گریجوایٹ اور سنجیدہ خاتون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نے کہا کہ تم بھی پہلے ''The Salvation of Nations'' پڑھ لو' تاکہ بعد میں ہماری زندگی میں کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔ بیگم نے کتاب کو بڑی گہرائی سے متعدد بار پڑھا تو اللہ نے آخر کار اسے بھی شرحِ صدر عطا کیا اور اس نے بھی دل وجان سے اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر لیا۔ پھر ہم نے

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\gulzar ahmad.inp 8/22/2014 4:40 PM PAGE 2 (1,1)

۲۷مارچ ۲۰۰۴ء کو قاری سعید احمد‘ جو میرے دوست بھی ہیں‘ کی وساطت سے جامعہ اشرفیہ میں جا کر اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے میری بیوی کا نام الزبتھ تھا‘ اب بتول فاطمہ ہے۔ میرا نام گلزار اے پال تھا‘ اب گلزار احمد ہے۔ بیٹی کا نام کومل پال سے سائرہ اور بیٹے کا اضحق سے اسحاق ہے۔

جب میں نے اسلام قبول کر لیا تو میرے سابقہ مذہبی حلقے میں زلزلہ برپا ہو گیا اور بھونچال آ گیا۔ اس لیے کہ کسی پادری کا اسلام قبول کرنا اُن کے نزدیک مسیحیت کا ناقابل تلافی نقصان تھا۔ سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ والوں کو میرے اسلام قبول کرنے کی خبر بذریعہ اخبار (The daily Nation) ۳/اپریل ۲۰۰۴ء کو ملی۔ چیئرمین نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ میں نے خبر کی تصدیق کر دی۔ انہوں نے بغیر کوئی نوٹس دیے مجھے نوکری سے فارغ کر دیا‘ بلکہ مجھے جو رہائش دی گئی تھی وہ بھی خالی کروا لی گئی۔ انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی مجھے بالکل توقع نہ تھی۔ وہ یہ کہ مجھ سے کہا گیا ”۲۷ سال کے عرصے میں جتنا میڈیکل الاؤنس لیا ہے واپس کر دو“۔ یہ رقم ۸۰ ہزار روپے بنتی تھی‘ جو میں نے گھر کا سامان بیچ کر لوٹا دی‘ اس لیے کہ مجھے اسلام کی دولت مل چکی تھی اور اس کے مقابلے میں دنیاوی دولت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کے بعد وقتی طور پر مشکلات آئیں۔ مقامِ شکر ہے کہ اللہ نے مجھے تمام مشکلات میں ثابت قدم رکھا۔ خاص طور پر میری اہلیہ اور بچوں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اہلیہ نے گھر میں ٹیوشن سنٹر کھول لیا۔ میرے دوست سلیم بخاری مجھے نیسلے کے ڈسٹری بیوٹر شیخ ذاکر کے پاس لے گئے اور وہاں مجھے ملازمت مل گئی۔

دوسری طرف پادری طبقہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آیا۔ مجھ پر قاتلانہ حملے کروائے گئے اور جان سے مارنے کی کوشش کی گئی۔ بعض عیسائی مسلمانوں کی ملکیت قومی اخبارات میں اہم پوسٹوں پر ہیں‘ انہوں نے بھی میرے قتل کی کوشش کی۔ ایک روز میں اپنے بیوی بچوں سمیت سروسز ہسپتال میں ایک مریض کی تیمارداری کے لیے گیا۔ وہاں کا سٹاف مجھے جانتا تھا‘ ان میں سے کسی نے میرے دشمنوں کو اطلاع کر دی۔ چنانچہ تیمارداری کرنے کے بعد جب ہم باہر نکلے تو ایک گاڑی نے سڑک پر ہمیں کچلنے کی کوشش کی۔ یہ محض اللہ کا فضل تھا کہ ہم بچ گئے۔ ایک بوڑھا شخص جو وہاں سے گزر رہا تھا‘ اس نے کہا ”گاڑی نے مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی‘ لیکن بچانے والا طاقتور ہے‘ اس نے آپ کو بچا لیا ہے“۔ میں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا۔ جب یہ نمبر ٹریس کیا گیا تو ایک پادری کی گاڑی کا نکلا۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے میں نے اپنے والدین سے مشورہ کیا تو انہوں نے شدید ردّ عمل کا اظہار کیا۔ میں نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوشش ناکام رہی۔ اسلام قبول کرتے ہی والد نے مجھے عاق کر دیا۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے والد کا سینہ بھی اسلام کے لیے کھول دے۔ یہی حال میرے سسرال کا ہے۔ وہ بھی ہم سے قطع تعلق کر چکے ہیں۔ ہمیں دُنیوی رشتوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ اصل' سچا اور حقیقی رشتہ اللہ کے سچے دین اور نبی آخرالزمان ﷺ کا ہے' یہ سب سے مضبوط اور پائیدار رشتہ ہے۔ باقی رہے مصائب' یہ تو اللہ کے برگزیدہ بندوں انبیاء علیہم السلام پر بھی آتے رہے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ حق پر چلنے والوں کے لیے حق کے دشمنوں نے پھول نچھاور کیے ہوں اور راستے میں قالین بچھائے ہوں۔ قرآن مجید میں اصحابِ کہف اور اصحاب الأخدود کے واقعات ہمارے لیے مثال ہیں۔

مسیحیت میں پائے جانے والے تضادات

اب میں مسیحیت میں پائے جانے والے تضادات کا تفصیل سے ذکر کرنا چاہتا ہوں' کیونکہ یہی تضادات میرے مسیحیت سے تائب ہونے اور اسلام قبول کرنے کا بنیادی سبب بنے ہیں۔ یہی وہ تضادات' اشکالات یا سوالات ہیں کہ جن کی خاطر میں بڑے بڑے پادریوں کے پاس گیا لیکن میری تسلی اور تشفی کہیں بھی نہ ہو سکی۔ اِن تضادات کو تفصیل سے بیان کرنے کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر میری طرح شاید کوئی دوسرا بھولا بھٹکا مسیحی بھی راہِ ہدایت پالے۔

۱) گناہ' کفارہ اور نجات کا تصور

مذہب عیسائیت میں ''گناہ' کفارہ اور نجات'' کے عقیدے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے' مگر عقل و فہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ پہلے مذکورہ تینوں اصطلاحوں کا سمجھنا ضروری ہے۔

گناہ : اصل اصطلاح ''اصلی گناہ'' (Original Sin) کی ہے۔ یہ عیسائی عقیدہ بائبل کی ''کتاب پیدائش'' سے ماخوذ ہے جس کے مطابق ''اماں حوا اور بابا آدم (علیہما السلام) نے باغِ عدن (جنت) میں رہتے ہوئے جو پہلا گناہ 'شجرِ ممنوع' کھانے کی صورت میں کیا تھا'' اصلی گناہ کہلاتا ہے۔ عیسائی عقیدہ کے مطابق یہ گناہ موروثی تھا اور اولادِ آدم میں بھی منتقل ہو گیا (رومیوں' باب ۵' آیت ۱۲)۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\gulzar ahmad.inp 8/22/2014 4:40 PM PAGE 3 (1,1)

سینٹ آگسٹائن کے مطابق ’’اور واقعہ یہ ہوا کہ تمام وہ انسان جو اصلی گناہ سے داغ دار ہوگئے‘ آدم سے اور اس عورت سے پیدا ہوئے جس نے آدم کو گناہ میں مبتلا کیا تھا اور جو آدم کے ساتھ سزا یافتہ تھی‘‘۔ اسی طرح مشہور پروٹیسٹنٹ مذہبی رہنما جان کارلوس بھی کہتا ہے: ’’واقعہ یہ ہے کہ ہمیں گناہ کا ایک وبائی مرض جاگزیں ہے جو آدم سے ہم کو لگا ہے‘‘۔ رومن کیتھولک عالم تھامس ایکووینا کے الفاظ: ’’ہمارے ماں باپ کے گناہ کی وجہ سے ’’اصلی گناہ‘‘ اُن کی اولاد میں بھی منتقل ہوگیا‘‘۔

کفارہ: کفارہ کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی وجہ سے جو گناہ اولادِ آدم میں منتقل ہوا تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جان کی قربانی دے کر اس کا کفارہ ادا کر دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں کفارہ کی تعریف کا خلاصہ یوں ہے:

> ’’عیسائی علم عقائد میں ’’کفارہ‘‘ سے مراد یسوع مسیح کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعے ایک گناہگار انسان یک لخت خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس عقیدے کی پشت پر دو مفروضے کارفرما ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے دُور ہو گیا تھا‘ دوسرے یہ کہ خدا کی صفت کلام (بیٹا) اس لیے انسانی جسم میں آئی تھی کہ وہ انسان کو دوبارہ خدا کی رحمت سے قربان کر دے‘‘۔

نجات: عیسائیت میں نجات کا تصور یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دکھ سہہ کر سب گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں‘ اس لیے جو انسان بھی آپؑ پر ایمان لاتا ہے وہ نجات پاتا ہے۔ کتاب اعمال‘ باب ۴‘ آیت ۱۲ میں ہے:

> ’’اور کسی دوسرے وسیلہ سے نجات نہیں‘ کیونکہ آسمان تلے آدمیوں کو کوئی دوسرا نہیں بخشا گیا جس کے وسیلہ سے ہم نجات پا سکیں‘‘۔

کتاب اعمال کے باب ۱۶ کی آیت ۳۱ میں بھی یہی تصور دیا گیا ہے۔

عیسائی عقیدہ کے مطابق یسوع مسیح کی قربانی صرف اُس شخص کے لیے ہے جو یسوع مسیح پر ایمان رکھے اور اُن کی تعلیمات پر عمل کرے۔ اور اس ایمان کی علامت ’’بپتسمہ‘‘ کی رسم ادا کرنا ہے۔ جو شخص بپتسمہ لے گا اس کا اصل گناہ معاف ہو جائے گا اور جو نہیں لے گا اس کا اصل گناہ برقرار رہے گا اور وہ دائمی عذاب کا مستحق ہوگا۔ مسیحی عالم ایکویناس (Aquinas) لکھتا ہے:

> ’’جو بچے بپتسمہ لینے سے پہلے مر گئے‘ ان میں چونکہ اصل گناہ برقرار ہے‘ اس لیے وہ

کبھی خداوند کی بادشاہت نہیں دیکھیں گے‘‘۔

گناہ‘ کفارہ اور نجات کے بارے میں مَیں نے آپ کو مختصراً بتایا ہے‘ اور بعض اوقات مختصر بات ابہام بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اگر کسی کے ذہن میں ابہام ہو تو وہ ان اصطلاحوں کو سمجھنے کے لیے تفصیلی مطالعہ کرے۔

گناہ‘ کفارہ اور نجات کا مسیحی عقیدہ میں نے بیان کیا۔ اسے عقل تسلیم نہیں کرتی کہ ایک فرد محض مسیحؑ پر ایمان لانے کی وجہ سے جنت میں چلا جائے گا خواہ اس نے کتنے ہی گناہ کیوں نہ کیے ہوں۔ اسلام کا تصور تو بڑا واضح ہے کہ جس نے ذرّہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اس کا اجر پا لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بھی بدی کی ہوگی وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ اسلام میں اللہ کا پیارا رسول ﷺ اپنی پیاری بیٹی سے بھی یہی کہتا ہے کہ اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو‘ وہاں اپنے اعمال ہی کام آئیں گے۔

بذاتِ خود یہ عقیدہ بائبل کی واضح تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔ مثلاً:

۱) جو جان گناہ کرتی ہے وہی مرے گی‘ بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور نہ باپ بیٹے کے گناہ کا بوجھ۔ (حزقی ایل ۱۸:۲۰)

۲) راست بازوں کی بابت کہو کہ بھلا ہوگا‘ کیونکہ وہ اپنے کاموں کا پھل کھائیں گے۔ شریروں پر واویلا ہے کہ ان کو بدی پیش آئے گی‘ کیونکہ وہ اپنے ہاتھ کا کیا پائیں گے۔ (یسعیاہ ۳۰:۱۰)

۳) بیٹوں کے بدلے باپ نہ مارے جائیں نہ باپ کے بدلے بیٹے مارے جائیں‘ ہر ایک اپنے ہی گناہ کے سبب مارا جائے۔ (استثناء ۲۴:۱۶)

بائبل کے مذکورہ احکام کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ کی سزا اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اور بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے تو پھر کرۂ ارض پر گناہوں کا سلسلہ کیوں جاری ہے؟ مزید برآں کفارہ کے بارے میں بھی بائبل کی تعلیمات مسیحی عقیدہ کی تائید نہیں کرتیں۔ مثلاً:

۱) شفقت اور سچائی سے بدی کا کفارہ ہوتا ہے اور لوگ خداوند کے خوف سے بدی سے باز آتے ہیں۔ (امثال ۱۶:۶)

۲) جو اپنے باپ کی عزت کرتا ہے وہ اپنے گناہوں کا کفارہ دیتا ہے۔ (یشوع بن سیراخ‘ باب ۳‘ آیت ۴) مزید فرمایا: خیرات گناہوں کا کفارہ ہے۔ (یشوع بن سیراخ‘ باب ۳‘ آیت ۳۳)

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\gulzar ahmad.inp 8/22/2014 4:40 PM PAGE 4 (1,1)

(نوٹ: یشوع بن سیراخ کے حوالے کیتھولک بائبل ''کلام مقدس'' سوسائٹی آف سینٹ پال روما ۱۹۵۸ء کے نسخہ کے صفحہ ۸۷۰ اور ۸۷۱ پر ملیں گے)

بلاشبہ ہمیں ''نجات'' کے حوالے سے اناجیل اربعہ میں چند آیات پڑھنے کو ملتی ہیں' مگر ان کا مفہوم تقریباً وہی ہے جیسے آج کوئی کسی لیڈر کے بارے میں کہے کہ اس نے اپنی جان قوم کو (فلاں فلاں مصائب/بحران سے) نجات دلانے کے لیے قربان کر دی۔ اس جملے کا ہرگز یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اس لیڈر کی قربانی سے قوم کے گناہ ہمیشہ کے لیے معاف ہو گئے اور اب قوم کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ جو چاہے گناہ کرے۔ عیسائیوں نے یہی مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح پوری عیسائی دنیا کو ''کفارہ' گناہ اور نجات'' کا غلط تصور دے دیا گیا۔ میرے ذہن نے اس تصور کو کبھی قبول نہ کیا۔

۲) یسوع مسیح یا عمانوایل؟

بائبل کی کتاب یسعیاہ میں ہے کہ ''دیکھو ایک کنواری حاملہ ہو گی اور بیٹا پیدا ہو گا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی''۔ (باب ۷' آیت ۱۴) بالکل یہی الفاظ انجیل متی کی آیت نمبر ۲۳ میں بھی ہیں' مگر ''متی'' کی آیت ۲۵ میں ہے کہ اس بچے کا نام ''یسوع'' رکھا گیا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کی طرح عیسائیوں کا عقیدہ بھی یہ ہے کہ حضرت مریم کنواری تھیں' مگر انجیل متی کی آیت ۱۶ اس کی تردید کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: ''اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا۔ یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا اور جو مسیح کہلاتا ہے''۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت مریم کنواری تھیں اور ان کی شادی نہیں ہوئی تھی تو پھر شوہر کہاں سے آ گیا؟ اور اگر اُن کا شوہر تھا تو پھر عیسیٰؑ بن باپ کے کیسے ہوئے؟ الٰہی کلام میں ایسا تضاد نہیں ہو سکتا۔

۳) ابن خدا کا تصور

مسیحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں' مگر اناجیل اس پر اتفاق نہیں کرتیں۔ مثلاً ''متی'' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: ''یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام'' جبکہ انجیل مرقس میں ''یسوع مسیح ابن خدا'' لکھا ہے۔ یاد رہے کہ بائبل میں ایک دو جگہ پر مسیح ابن خدا کا لفظ تو آیا ہے لیکن مسیح ابن اللہ کے الفاظ کہیں نہیں آئے۔ ویسے بائبل کے پرانے عہد نامے میں اللہ کا لفظ دو بار آیا ہے۔ پھر بائبل میں بے شمار مقامات پر حضرت مسیح علیہ السلام کے علاوہ دوسرے انسانوں کو بھی خدا کا بیٹا کہا گیا ہے۔ مثلاً کتاب پیدائش' باب ۶' آیت ۲' زبور ۸۹:۲۷' یرمیاہ

۹:۳۱' یسعیاہ۶۳:۱۶' ایوب ۷:۳۸' تواریخ اوّل ۹:۲۲' ۶:۲۸' خروج ۲۲:۴' زبور۶:۸۲' ایوب۶:۱' استثناء' باب ۱۴' زبور ۵:۶۸' اعمال ۲۹:۱۷۔ مزید برآں اناجیل اربعہ میں بے شمار مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے ابنِ آدم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس طرح عیسائیوں کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔

۴) بپتسمہ کا نظریہ

بپتسمہ کا نظریہ مسیح علیہ السلام کے ساتھ دفن ہونے کا نظریہ ہے۔ جب ایک فرد بپتسمہ لینے کے لیے پانی میں جاتا ہے تو وہ یہ تصور کرتا ہے کہ وہ مسیحؑ کے ساتھ دفن ہونے جا رہا ہے۔ پانی سے باہر آنے کا مطلب ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ بپتسمہ کے معنی رنگنے جانا اور تبدیل ہونے کے بھی ہیں۔ اس کا مقصد ذاتی گناہوں سے' بلکہ اپنی فطرت کی موروثی کمزوری اور خرابی سے نجات پانا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ عیسائی عقیدے کے مطابق جو فرد بپتسمہ نہ لے وہ خدا کی بادشاہی میں داخل نہیں ہوسکتا۔ محض بپتسمہ کی رسم ادا کرنے سے گناہوں سے نجات پا لینا میری سمجھ سے باہر تھا۔ یہ ایک باقاعدہ رسم ہے جو عیسائی مذہب میں داخل ہونے کے لیے ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم کی پشت پر کفارے کا عقیدہ کارفرما ہے کہ بپتسمہ لینے سے انسان یسوع مسیح کے واسطہ سے ایک بار مر کر دوبارہ زندہ ہوتا ہے' موت کے ذریعے اس کے ''اصلی گناہ'' کی سزا ملتی ہے اور گناہ سے پاک اسے ایک نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

یسوع مسیح کی رسم بپتسمہ کے بارے میں اناجیل میں جو بیان ہوا ہے' اس میں تضادات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انجیل متی' باب ۳' آیت ۱۳ تا ۱۷ میں ہے کہ جناب یسوع نے یوحنا سے بپتسمہ لیا اور اسی وقت یا اسی دن وہ یوحنا سے جدا ہو گئے۔ لیکن یوحنا کی انجیل میں بپتسمہ لینے کا کوئی ذکر نہیں اور یسوع اور یوحنا کی ملاقات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ دو دن جاری رہی۔

۵) عقیدۂ تثلیث

عقیدۂ تثلیث مسیحی عقائد کا سب سے زیادہ پیچیدہ عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کے مطابق ایک خدا میں تین ہیں' یعنی باپ' بیٹا (یسوع مسیح) اور روح القدس۔ یعنی خدا تین اقانیم سے مرکب ہے۔ ان کو اقانیم ثلاثہ کہتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تثلیث کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے: ''تثلیث کے عیسائی نظریہ کو اِن الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ باپ خدا ہے' بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے۔ یہ تین مل کر تین خدا نہیں بلکہ ایک ہی خدا

ہے''۔بعض عیسائی فرقوں میں باپ' بیٹا اور کنواری مریم اقانیم ثلاثہ ہیں۔سوال یہ ہے کہ جب باپ' بیٹا' روح القدس یا کنواری مریم میں سے ہر ایک کو خدا مان لیا گیا اور ہر ایک کو مستقل بالذات وجود تسلیم کرلیا گیا تو خدا ایک کہاں رہا؟ یہ عقیدہ بھی کسی صاحب علم وشعور کو اپیل نہیں کرتا' بلکہ عقیدۂ توحید کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ بائبل کی تعلیمات بھی اس عقیدہ کے خلاف ہیں۔مثلاً چند حوالے ملاحظہ فرمائیں:

۱) پس آج کے دن تو جان لے اور اس بات کو اپنے دل میں جمالے کہ اوپر آسمان میں اور نیچے زمین میں خداوند ہی خدا ہے اور کوئی دوسرا نہیں۔(استثناء' باب۴' آیت ۳۹)

۲) ایک فقیہہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا:''سب حکموں میں سب سے اہم اور اوّل کون سا ہے؟''اور یسوع نے اسے جواب دیا کہ سب احکام میں اوّل یہ ہے:''اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح و جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ''۔(مرقس۱۲:۲۹'۳۰)

۳) تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔(متی۴:۱۰)

اور بھی بے شمار جگہوں پر خدائے واحد ہی کا ذکر ہے مگر عیسائیوں نے اپنے عقائد میں ''عقیدۂ تثلیث'' شامل کرکے ربِّ واحد کا تصور ختم کر دیا ہے۔ایک خدا پر ایمان رکھنے والا عقیدۂ تثلیث کو تسلیم نہیں کرسکتا۔

۶) عقیدۂ مصلوبیت

عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر چڑھایا گیا' صلیب پر اُن کی موت واقع ہوئی اور تیسرے دن وہ پھر جی اٹھے۔اس عقیدہ کی پشت پر جو فلسفہ ہے وہ میں ''کفارہ ونجات'' کے حوالے سے بیان کرچکا ہوں۔ایک طرف تو عیسائی انہیں خدا اور ابنِ خدا تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف اناجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دیے جانے کا منظر نہایت بے بسی کا ہے۔خدا یا خدا کا بیٹا اس قدر بے بس نہیں ہوسکتا۔لوگ چیلنج کررہے ہیں :''اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب سے اتر آ''۔(متی ۲۷:۴۰)''اب صلیب پر سے اتر آئے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں''۔(متی ۲۷:۴۲) ایسے ہی الفاظ مرقس اور لوقا میں ہیں۔

چونکہ بائبل میں تحریف کی گئی ہے اس لیے اس کے اندر بڑے تضادات پائے جاتے ہیں۔یہ تضادات انسان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔انبیاء علیہم السلام اور برگزیدہ

ہستیوں کی بائبل میں کردار کشی کی گئی ہے۔ بعض جگہ تو خدا اِس قدر بے بس نظر آتا ہے کہ اپنی ہی مخلوق کے ہاتھوں پچھاڑا جاتا ہے۔

۷) عیسائی ختنوں کے خدائی حکم پر عمل نہیں کرتے

ختنہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔

کتاب پیدائش میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا:

''تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت اسے مانے اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے' سو یہ کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے......اور میرا عہد تمہارے جسم میں ابدی عہد ہوگا اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو' وہ اپنے لوگوں سے کاٹ ڈالا جائے' کیونکہ اُس نے میرا عہد توڑا''۔ (پیدائش ۱۷: ۱ تا ۱۴)

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے''۔ (احبار ۱۲: ۳)

خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ختنے کرائے۔ انجیل لوقا' باب ۲' آیت ۲۱ میں ہے:

''جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کے ختنے کا وقت آیا تو اُس کا نام یسوع رکھا گیا''۔

کتاب اعمال' باب ۱۵' آیت ۱ میں ہے:

''اگر موسیٰ کی رسم کے موافق تمہارا ختنہ نہ ہو تو تم نجات نہیں پا سکتے''۔

عیسائی ان احکام پر عمل نہیں کرتے' ان کے برعکس مسلمانوں نے ختنے کے خدائی احکام کو اپنایا ہوا ہے۔ ختنے کے احکام پر عمل نہ کرنے نے مجھے عیسائیت سے دُور کیا ہے۔

چند سوال اور اُن کے جواب

سوال: اسلام کے اندر آپ کو کون سی خوبیاں نظر آئیں کہ آپ نے تمام مذاہب میں سے اس کا انتخاب کیا؟

جواب: مختصراً یہ کہوں گا کہ عقیدۂ توحید نے مجھے سب سے زیادہ متأثر کیا۔ سورۃ الاخلاص توحید کا جوہر ہے اور یہ عقیدۂ تثلیث کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ دوسری بات مساجد میں انسانی امتیازات کی جگہ مساوات کا پایا جانا ہے۔ مسجد میں آقا و غلام کو ایک ہی صف میں کھڑا ہونا پڑتا ہے' آقا کو الگ جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اور اگر غلام پہلی صف میں کھڑا ہے تو اسے کوئی پچھلی صف میں نہیں دھکیل سکتا۔ چرچ میں امتیازات پائے جاتے ہیں۔ تیسری بات

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\gulzar ahmad.inp 8/22/2014 4:40 PM PAGE 6 (1,1)

اسلام کا عقیدۂ نجات ہے کہ آخرت میں جزا و سزا کا انحصار انسانوں کے اعمال پر ہے۔

انجیل برنا باس میں توحید الٰہی اور نبی آخر الزمان ﷺ کی آمد کی پیشین گوئی کی جاتی ہے‘ اس لیے عیسائی اس انجیل کو نہیں مانتے

سوال: انجیل برنا باس کو عیسائی کیوں نہیں مانتے؟

جواب: اِس وقت دنیا میں جتنی انجیلیں پائی جاتی ہیں‘ عیسائیوں کے ایک حلقے کے مطابق ان میں سے انجیل برنا باس صحیح ترین انجیل ہے۔ آثارِ قدیمہ میں سے اس انجیل کے جو قدیم ترین نسخے برآمد ہوئے ہیں‘ موجودہ انجیل برنا باس اور قدیم نسخوں میں کوئی فرق نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں کہ ’’لودیکنہ‘‘ کی میٹنگ میں جو عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ۳۲۱ سال بعد ہوئی تھی‘ اس کونسل نے چار انجیلوں کی منظوری دی تھی: انجیل یوحنا‘ انجیل مرقس‘ انجیل متی اور انجیل لوقا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ ان چاروں کے لکھنے والے عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ انجیل برنا باس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہت بعد میں لکھی گئی۔ حالانکہ ایسی بات نہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ انجیل ۳۹ عیسوی میں لکھی گئی ہے۔ اس کے باوجود اس انجیل کو نہ ماننے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں اللہ کی توحید کا بہت زیادہ ذکر ہے‘ عیسیٰ علیہ السلام کی بجائے ان کے ایک ہم شکل کے مصلوب ہونے کا ذکر ہے جو عیسائیوں کے بنیادی عقیدے کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں نبیٔ آخر الزمان ﷺ کی آمد کی پیشین گوئی بھی ہے۔

سوال: عیسائی دنیا میں مسلمانوں کے خلاف کس قسم کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں؟

جواب: سب سے بڑی سازش ہے مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی۔ ان کے طریقۂ واردات میں سے ایک یہ ہے کہ پادری غیر محسوس طریقے سے مسلمانوں کو باور کراتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے جو معجزات بائبل میں موجود ہیں وہ قرآن میں بھی ہیں۔ ان کی پیدائش کا واقعہ جو قرآن میں ہے وہ بھی بائبل میں ہے۔ گویا اسلام اور عیسائیت ایک ہی چیز ہے۔ اسی طرح رفاہی اور فلاحی کاموں کے ذریعے بھی مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ملتان میں ایک بہت اچھا ’’ویمن ہسپتال‘‘ ہے۔ اس کا کارڈ بڑی مشکل اور سفارشوں سے بنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی پادری کسی شخص کو لکھ کر دے دے کہ ’’میں اس شخص کو جانتا ہوں‘‘ تو ایسے شخص کا فی الفور کارڈ بن جاتا ہے۔ پھر ایسے شخص کی مریضہ کا علاج بھی مفت ہوتا ہے۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ اگر کوئی شخص ویمن ہسپتال میں اپنی بیوی یا بیٹی کا علاج کروانا

چاہتا ہے تو پہلے اسے چرچ میں جا کر پادری سے راہ و رسم پیدا کرنی ہوگی۔ جب وہ چرچ میں پادری کے پاس جائے گا تو یقیناً پادری اپنے حسن سلوک وغیرہ کے ذریعے عیسائیت سے بھی متاثر کرنے کی ضرور کوشش کرے گا۔

سوال: پاکستان میں مسلمانوں سے عیسائی ہونے والوں کی شرح کیا ہے؟

جواب: پاکستان میں ایک ادارہ ''اخوت ادریسیہ'' کے نام سے کام کر رہا ہے۔ میں اس ادارے کا جنرل سیکرٹری رہا ہوں۔ اس ادارے نے ۱۹۷۲ء سے لے کر ۲۰۰۳ء تک جو اعداد و شمار اکٹھے کیے ہیں' ان کے مطابق اب تک تقریباً ۲۵۰۰۰ مسلمان عیسائی ہوئے ہیں۔ پنجاب میں عیسائیوں کے لیے آسان چراگاہ ڈیرہ غازی خان اور ملتان کے علاقے ہیں۔ ان علاقوں میں چونکہ بہت زیادہ غربت پائی جاتی ہے اس لیے یہاں کثرت سے مسلمان عیسائی ہوئے ہیں۔

سوال: عیسائیت میں جو آپ کے دوست تھے' آپ کی تبلیغ کی وجہ سے کیا ان میں بھی کچھ مسلمان ہوئے ہیں؟

جواب: جو پادری کے طور پر میرے پاس پڑھتے رہے ہیں انہیں میں نے قرآن مجید کے نسخے دیے ہیں۔ اس کے جواب میں ان کی طرف سے ابھی تک کوئی سوالات میرے پاس نہیں آئے۔ اس لیے میں فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا کہ وہ اسلام قبول کرلیں گے یا نہیں۔

سوال: اگر کسی مسلمان کو عیسائی مبلغین یا پادریوں کے ساتھ گفتگو کرنی پڑے تو کیسے کی جائے؟

جواب: اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ عیسائیوں سے گفتگو کرنے والے مسلمانوں کو ''The Salvation of Nations'' نامی کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ ہمیں ایک ایسا فورم تشکیل دینا چاہیے جس کے ذریعے عیسائی مبلغین سے بات کرنے والے لوگوں کی تربیت کی جائے۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ باطل قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو ذہنی' فکری اور عملی طور پر تیار نہیں کیا جاتا۔ اس کے مقابلے میں قادیانی اس محاذ پر بہت زیادہ کام کر رہے ہیں۔ ان کے ایک چھوٹے سے بچے کو بھی ساری معلومات ازبر ہوتی ہیں۔ کچھ دن پہلے میرے پاس ایک قادیانی آیا اور کہنے لگا ''گلزار صاحب! مسیح موعود آ چکے ہیں' آپ نے مسیح موعود کا دامن تھامنے کی بجائے اسلام قبول کرلیا ہے؟ آپ کو چاہیے کہ آپ مسیح موعود کی صداقت کو تسلیم کر کے ہمارے ساتھ آ جائیں''۔ میں نے کہا قرآن وحدیث

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\gulzar ahmad.inp 8/22/2014 4:40 PM PAGE 7 (1,1)

یا بائبل میں جس مسیح کا ذکر ہے وہ مسیح ابن مریم ہے۔ تم جس مسیح کی بات کر رہے ہو وہ مسیح ابن چراغ بی بی (مرزا غلام احمد قادیانی) ہے۔ اگر تم قرآن و حدیث اور بائبل میں مجھے مسیح ابن مریم کی بجائے مسیح ابن چراغ بی بی دکھا دو تو میں تمہارے مسیح کو مان لوں گا۔ میری بات کے جواب میں اسے بالکل ہی چپ لگ گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ہمارے پاس دوسرے کے بارے میں مکمل معلومات ہوں گی تو ہم اسے مسکت جواب دے سکیں گے۔

اسی طرح عیسائی مسلمانوں سے ایک سوال یہ کیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی حضرت خدیجہ ؓ کے ساتھ شادی کس شریعت کے تحت ہوئی؟ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ آپؐ کی شادی پہلے ہوئی اور شریعتِ محمدیؐ بعد میں نازل ہوئی اور آپؐ کا نکاح پڑھانے والے ورقہ بن نوفل ایک یہودی عالم تھے‘ لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر کا پہلا نکاح یہودی مذہب کے تحت پڑھا گیا۔ جب مسلمان علماء سے یہ سوال کیا جاتا ہے تو وہ بالعموم اس کا جواب نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک بے مقصد سوال ہے‘ اس کا جواب دینا ضروری نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب مسلمان علماء سے اس قسم کے سوالات پوچھے جائیں تو انہیں چاہیے کہ سائل کو پوری طرح مطمئن کریں۔ اس لیے کہ مطمئن نہ ہونے کی صورت میں سائل آسانی سے باطل فرقوں کے ہتھے چڑھ سکتا ہے۔

سوال: پاکستان میں بڑے بڑے چرچ ہیں‘ جو آباد بھی ہیں‘ اس کے برعکس یورپ میں چرچ ویران ہو رہے ہیں۔ یہ بتائیں کہ پاکستان میں چرچ کے آباد ہونے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں پادری کو لوگوں کے گھروں میں جا کر تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہے‘ اس کے برعکس پاکستان میں ایک پادری دن میں کم از کم پندرہ گھروں میں جاتا ہے‘ اہل خانہ کے ساتھ گفتگو کرتا ہے‘ ان کے گھریلو اور سماجی مسائل کو سنتا ہے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں لوگ چرچ جاتے ہیں اور چرچ کے ساتھ اُن کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

سوال: پاکستان میں بڑے بڑے شفائیہ اجتماعات ہوتے ہیں‘ ان میں مسلمان بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ بتائیں کہ ان اجتماعات کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: یہ سب شفائیہ اجتماعات ڈھونگ ہیں۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ شفائیہ اجتماع میں شریک ہونے سے بیمار صحت مند‘ اندھے بینا اور اپاہج درست ہو جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس قسم کے اجتماعات پوری دنیا میں ہو رہے ہیں۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ سب لوگ شفایاب ہو

جاتے، لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ ان اجتماعات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان اجتماعات کا مقصد مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ ہے۔ پاکستان کے زیادہ تر مسلمان چونکہ ضعیف العقیدہ ہیں، پھر یہاں صحت کی سہولتیں بھی کم ہیں، اگر ہیں تو وہ بہت زیادہ مہنگی ہیں، اس لیے کمزور عقیدے اور کمزور مالی پوزیشن کے مسلمان ایسے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کو جسمانی شفا تو نہیں ہوتی البتہ وہ اپنا ایمان بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔

سوال: پاکستان میں عیسائیوں کے جو فرقے کام کر رہے ہیں، ان کے متعلق کچھ بتائیں!

جواب: پاکستان میں دو بڑے فرقے ہیں، ایک کیتھولک اور دوسرا پروٹسٹنٹ ہے۔ اس سے آگے کی صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں کیتھولک کے ۲۸ فرقے اور پروٹسٹنٹ کے ۳۱۷ فرقے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر فرقے کا مین آفس انگلینڈ میں ہے یا امریکہ میں۔ بہت کم فرقے ایسے ہیں کہ جن کا مین آفس جرمنی یا کینیڈا میں ہے۔

سوال: انڈونیشیا میں عیسائیوں نے ایسٹ تیمور کے نام سے مذہبی بنیادوں پر ایک الگ ریاست قائم کی ہے۔ شنید ہے کہ اس طرح پاکستان میں بھی عیسائی مذہبی بنیادوں پر کسی خطے کے لیے کام کر رہے ہیں؟

جواب: یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں عیسائی اس بنیاد پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کی کوشش ہے کہ پاکستان میں مذہبی بنیادوں پر کام کر کے کسی خطے پر اپنی بالادستی قائم کر لی جائے۔

سوال: اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی انوکھا اور عجیب وغریب واقعہ بتائیں جو آپ کو پیش آیا ہو!

جواب: ایک دفعہ میں مزنگ اڈا لاہور میں نماز کے لیے گیا تو مسجد کے خطیب صاحب تقریر کرتے ہوئے لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ ''اگر مسجد میں کوئی وہابی اہلحدیث آ جائے تو مسجد دھو دینی چاہیے''۔ مجھے ان کی بات سن کر بہت دکھ ہوا۔ میں نے وہاں نماز تو نہ پڑھی البتہ ایک دن میں نے مسجد کے خطیب صاحب سے ملاقات کی۔ ان کے سامنے میں نے قرآن مجید کے متعدد نسخے اور حدیث کی کتابیں رکھیں اور پھر میں نے ان سے کہا ''مولوی صاحب! آپ کا یہ کہنا ہے کہ اہلحدیث مسجد میں آ جائے تو مسجد ناپاک ہو جاتی ہے۔ مجھے ذرا قرآن اور حدیث میں یہ مسئلہ دکھا دیں تاکہ میری تسلی ہو جائے''۔ کہنے لگے: ''میں نے یہ مسئلہ پڑھا تو کہیں نہیں البتہ میں نے اپنے استاد سے سنا ہے''۔ میں نے کہا کہ ''چلیں اپنے

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\gulzar ahmad.inp 8/22/2014 4:40 PM PAGE 8 (1,1)

استاد سے ملاقات کروا دیں‘ ان سے پوچھ لیتے ہیں’’۔ وہ شاہدرہ میں مجھے اپنے استاد کے پاس لے گئے۔ شاہدرہ میں ان کے استاد اصل میں ایک نام نہاد پیر ہیں جنہیں میں اس سے پہلے بھی ذاتی طور پر جانتا تھا۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا ’’اللہ کے بندے! جسے تم اپنا استاد کہہ رہے ہو یہ تو خود بیچارہ اَن پڑھ اور جاہل ہے’’۔ خیر میں نے سوچا اب آئے ہوئے ہیں تو پیر صاحب سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔ جب ان سے میں نے پوچھا تو وہ کہنے لگے ’’پڑھا تو میں نے بھی کہیں نہیں‘ بس میں نے بھی اپنے استاد سے سنا تھا’’۔ میں نے ان سے کہا ’’اللہ کے بندے! رسول اللہﷺ نے تو نجران کے عیسائی وفد کو مسجد نبویؐ میں ٹھہرایا تھا اور ایک تم ہو کہ نبی کے اُمتی ہو کر اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کو مسجد سے نکال رہے ہو!’’

سوال: جس طرح عیسائیوں میں بہت سے فرقے ہیں اسی طرح مسلمانوں میں بھی بہت سے فرقے ہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ نے کسی فرقے سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے یا اسلام کی آفاقی اور ابدی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے ہیں؟

جواب: میرے بھائی! بات یہ ہے کہ فرقے وغیرہ تو سب رسول اللہﷺ کے بعد کی باتیں ہیں۔ آپؐ کے مبارک دَور میں فرقے نہیں تھے۔ فرقے ائمہ اربعہ کے بعد شروع ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں نے جو اسلام قبول کیا ہے‘ کسی فرقے سے نہیں بلکہ اسلام کی آفاقی تعلیمات سے متاثر ہو کر قبول کیا ہے۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ جو چیز قرآن اور حدیث میں ہے اسے مان لو اور جو چیز قرآن و حدیث میں نہیں اسے چھوڑ دو۔ OO

جہاد اور دہشت گردی

تحریر: حافظ محمد زبیر

۱۱/۹ کے بعد ۷/۷ کے حالیہ واقعہ کی وجہ سے ایک دفعہ پھر مغربی دنیا اپنے تمام تر وسائل اور ذرائع ابلاغ کے ساتھ پوری دنیا کے مسلمانوں کے خلاف بالعموم اور اہل پاکستان کے خلاف بالخصوص معرکہ آرا ہو گئی ہے۔ مغرب میں عرصۂ دراز سے یہ فلسفہ شدّ ومدّ کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے کہ اپنی قوم کے اندرونی اتحاد و اتفاق کے لیے عوام الناس کے سامنے ایک مشترکہ دشمن کا تعین کیا جائے۔ آج سے پہلے اہل مغرب کی متمدن عیسائی دنیا کا دشمن یہودی تھا۔ لیکن ایک صدی سے امریکہ میں بالخصوص اور یورپی ممالک میں بالعموم یہود معاشی اداروں اور ملٹی میڈیا پر چھا گئے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام ہو یا ان کا الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا' سب یہود کے قبضہ میں ہیں۔ وہ جس طرح سے چاہتے ہیں اہل مغرب کی سوچ کو پہلے سے متعین (Pre-planned) نظریات اور اہداف کی تکمیل کے لیے ایک رُخ دیتے ہیں۔

پچھلی کئی دہائیوں سے یہود کی یہ مسلسل کوشش رہی ہے کہ وہ مغرب کی متمدن عیسائی دنیا کے سامنے اپنی جان بچانے کے لیے ایک مشترکہ دشمن کو پیش کریں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے امریکہ میں موجود اُن یہودیوں نے جو کہ اہم کلیدی عہدوں پر فائز ہیں یا میڈیا کے ساتھ وابستہ ہیں' روس اور دوسری کمیونسٹ ریاستوں کو امریکی عوام کے سامنے ایک مشترکہ دشمن کے طور پر پیش کرنا شروع کیا' جس کے نتیجے میں امریکی و مغربی قیادت یہود سے صرفِ نظر کرتے ہوئے روس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسّی (۸۰) کی دہائی میں مغرب سے شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل میں لکھے جانے والے اکثر مضامین (Articles) سرخ نفرت (The Red Menace) اور سرخ خطرہ (The Red Peril) جیسے عناوین سے شائع ہوتے رہے۔ بالآخر امریکہ اور روس میں ایک نظریاتی جنگ شروع ہو گئی۔ لیکن ۱۹۹۱ء میں یو ایس ایس آر کے ٹوٹنے کے بعد یہود

کے لیے دوبارہ یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ اب وہ مغرب کی متمدن عیسائی دنیا کے سامنے کس کو بطور دشمن کے پیش کریں؟ اس کے لیے انہوں نے اُمتِ مسلمہ کا انتخاب کیا۔ چنانچہ یہود نے اپنے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے اہل مغرب کے سامنے یہ ثابت کیا کہ تمہاری اعلیٰ اقدار کو اِن مسلمانوں سے خطرہ ہے۔ ہمارے استاذ محترم ڈاکٹر اکرم چوہدری صاحب کے بقول پچھلے پندرہ سال میں یہود کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ:

> *The Jews has identified a new enemy for the developed Western World.*

چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پچھلے دس برسوں میں مغرب میں لکھی جانے والی کتابوں اور مضامین کے عناوین وہی رہے ہیں' صرف سرخ (Red) کی جگہ سبز (Green) نے لے لی ہے۔ چونکہ اللہ کے رسولﷺ کے روضۂ اطہر کا رنگ سبز ہے اور سبز رنگ مسلمانوں کی علامت و پہچان کے طور پر معروف ہے' اسی وجہ سے مغرب میں لکھی جانے والی کتب اور مضامین میں سبز (Green) رنگ کے حوالے سے اُمتِ مسلمہ پر تنقید کی جاتی ہے۔ مثلاً سبز خطرہ (The Green Peril)' سبز نفرت (The Green Menace)۔ اسی طرح The Militant Islam' The Radical Islam جیسے مضامین سے اسلام کا غلط تصور اہل مغرب کے ذہنوں میں بٹھایا گیا ہے۔ ایک مضمون کا عنوان ہے: ''The Muslims are Coming'' گویا مصنف اس مضمون کے ذریعے اپنے عوام کے سامنے مسلمانوں کی یہ تصویر پیش کر رہا ہے کہ جیسے گھوڑوں پر سوار کوئی جنگلی مخلوق گردنوں میں تلواریں حمائل کیے تیزی سے مغرب کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے' تاکہ اہل مغرب کو تہہ تیغ کر دے۔ ابھی حال ہی میں فرانسیسی فوکویاما کا ایک مضمون: ''انسانیت کا اصل دشمن'' (The Real Enemy) کے نام سے سامنے آیا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ انسانیت کا اصل دشمن مسلمان ہے' لہٰذا سارے مغرب کو متحد ہو کر اپنی تمام تر توانائیاں مسلمانوں کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے کھپا دینی چاہئیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اسلام کے تصورِ جہاد و قتال کو مسخ کر کے اور اپنے من مانے مفاہیم پہناتے ہوئے مغربی دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔

مختلف مکاتبِ فکر کے نزدیک تصورِ جہاد و قتال

مغرب کے ان اعتراضات والزامات کے ردّعمل کے طور پر اُمتِ مسلمہ میں اسلام

کے تصورِ جہاد و قتال کے بارے میں چار مختلف قسم کے مکاتب فکر وجود میں آئے، جن کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم اسلام کے صحیح و صالح تصورِ جہاد کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلا مکتب فکر: اِن لوگوں نے عصر حاضر کی رعایت میں حالات کو سامنے رکھتے ہوئے جہاد و قتال کو منسوخ قرار دیا۔ عصر حاضر میں غلام احمد قادیانی نے اس موقف کو کھل کر پیش کیا۔ ع ''دیں کے لیے حرام ہے اب دوستو قتال!''

دوسرا مکتب فکر: اِس مکتبِ فکر کے حاملین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام میں جہاد و قتال صرف دفاعی ہے، اقدامی قتال جائز نہیں ہے۔ ہمارے ہاں وہ سارے مسلم مفکرین جو عقل کو نقل پر ترجیح دیتے ہیں اور مغربی فلسفہ و فکر سے متاثر ہیں، اپنے اس موقف کو پورے شدّ و مدّ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ انڈیا کے مسلمان دانشور مولانا وحید الدین خان صاحب اور پاکستان میں فکر اصلاحی کے نمائندے علامہ جاوید احمد غامدی صاحب کا یہی موقف ہے۔ صدر مرکز اسلامی مولانا وحید الدین خان صاحب ماہنامہ ''الرسالہ'' جولائی ۲۰۰۵ء کے شمارے میں صفحہ ۳۶ پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں نے اپنی تحریروں میں بار بار یہ واضح کیا ہے کہ اسلام کا اقدامی عمل پُر امن دعوت ہے۔ جہاد (بمعنی قتال) ایک دفاعی کارروائی ہے، جو استثنائی طور پر کبھی پیش آتا ہے۔ مزید یہ کہ اس دفاعی کارروائی کا حق باضابطہ طور پر قائم شدہ حکومت کو ہے، غیر حکومتی تنظیموں کو ہرگز مسلح جہاد کی اجازت نہیں''۔

تیسرا مکتب فکر: تیسرا مکتبِ فکر اُن علماء کا ہے جو قرآن و سنت کی نصوصِ ظاہر یہ سے استدلال کرتے ہوئے قتال کا مقصد کفر اور کفار کا خاتمہ بتلاتے ہیں۔ یہ موقف بھی متشدّدانہ رائے پر مبنی ہے۔ اکثر جہادی تحریکوں اور تنظیموں سے وابستہ علمائے کرام کا یہی نظریہ ہے۔ اِن علماء کے نزدیک مسلمان لشکر جب کافر ممالک کی طرف جہاد کے لیے نکلیں گے تو کافروں کو دو چیزوں میں سے ایک کا اختیار ہوگا۔ یا تو وہ اسلام قبول کر کے مسلم برادری میں شامل ہو جائیں یا انکار کی صورت میں اُن پر جنگ مسلط کر دی جائے، کوئی تیسری صورت ان کے لیے جائز نہیں ہے۔

چوتھا مکتبِ فکر: جہاد کے بارے میں سب سے درست نقطۂ نظر جمہور علماء کا ہے۔

ان کے نزدیک جہاد و قتال جن اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لیے کیا جانا چاہیے وہ حسب

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms02-08 jihad and terrism.inp 8/22/2014 4:41 PM PAGE 2 (1,1)

ذیل ہیں۔

جہاد کے مقاصد

شیخ عبدالکریم زیدان اپنی کتاب ''اصول الدعوۃ'' میں بیان فرماتے ہیں کہ جہاد کے تین مقاصد ہیں:

۱) **ظلم وزیادتی کے خلاف:** اگر کوئی قوم یا ریاست مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کی مرتکب ہو تو پھر مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ ایسی قوم سے لڑائی کریں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾﴾ (البقرۃ)

''اور اللہ کے راستے میں اُن لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو' بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

۲) **ضعیف اور کمزور مسلمانوں کی مدد کے لیے:** غیر مسلم ریاستیں ہوں یا مسلمان' جہاں بھی مسلمان کمزور ہوں یا تعداد میں کمی کی وجہ سے دوسری اقوام ان پر ظلم کریں' تو ایسے کمزور وضعیف مسلمانوں کی مدد کے لیے جہاد کرنا ضروری ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا ﴿۷۵﴾﴾ (النساء)

''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں قتال نہیں کرتے؟ حالانکہ ضعیف وکمزور مرد' عورتیں اور بچے یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں' اور ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک والی اور مددگار بنا!''

۳) **شریعت الٰہی کی اقامت وتطبیق کے لیے:** قتال کی یہ وہ قسم ہے جس کی ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہوتی ہے۔قتال کی پہلی دو شکلیں دفاعی ہیں' جبکہ یہ اقدامی ہے۔قتال کی اس قسم کے بارے میں شیخ عبدالکریم زیدان فرماتے ہیں:

''وَمِنْھَا : اَنْ یَبْدَاَ الْمُسْلِمُوْنَ قِتَالَ الْکَفَرَۃِ اِذَا اَفْضَوْا الْاِسْلَامَ وَمَنَعُوا الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ تَوَلِّی الْحُکْمِ وَالسُّلْطَانِ لِاِقَامَۃِ شَرْعِ اللّٰہِ وَتَطْبِیْقِہٖ فِی

اَلْاَرْضِ وَھٰذَا ھُوَ الَّذِیْ یُجَادِلُ فِیْہِ الْبَعْضُ ...... وَالْحَقِیْقَۃُ اَنَّ الْقُرْآنَ وَالسُّنَّۃَ یَدُلَّانِ عَلٰی ھٰذَا النَّوْعِ مِنَ الْقِتَالِ"

''اوراس (جہاد) کی اقسام میں سے ایک قسم یہ بھی ہے کہ مسلمان کافروں سے اس وقت قتال کریں جب وہ اسلام کو قبول کرنے سے انکار کردیں اور زمین میں مسلمانوں کو اللہ کی شریعت کی اقامت اور تطبیق کے لیے سلطنت وحکومت حاصل کرنے سے روکیں۔ اگرچہ بعض لوگ قتال کی اس قسم کا انکار کرتے ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن وسنت سے قتال کی اس قسم کا اثبات ہوتا ہے''۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ﴾ (الانفال:۳۹)

''اوراُن سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اوردین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہوجائے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما' قتادہ' مجاہداورالربیع رحمہم اللہ کے نزدیک یہاں پر فتنے سے مراد کفر وشرک ہے' یعنی ایسا کفر وشرک جو کہ اجتماعی ہو' کیونکہ اسلام انفرادی کفر وشرک کو برداشت کرتا ہے' جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قف﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

''دین میں کوئی جبر نہیں ہے''۔

یعنی دین (اسلام) قبول کرنے میں کسی پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے گا۔لیکن اجتماعی طور پر کفر و شرک کا خاتمہ اسلام کا مطمح نظر ہے۔یعنی اجتماعیت میں تو دین اسلام ہی نظامِ حکومت کے طور پر نافذ ہوگا' لیکن انفرادی طور پر لوگوں کو اپنے اپنے عقائد' عبادات اور رسومات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت ہوگی۔

اسلام میں دہشت گردی کا تصور

دہشت گردی کی تعریف متعین کرنے میں مغربی مفکرین ابھی تک کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہوسکے' لیکن اسلام نے دوٹوک انداز میں دہشت گردی کی تعریف کو بیان کردیا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کے مطابق وہ لوگ جو کہ اسلامی معاشرے میں ایسے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں جن سے لوگوں میں خوف وہراس' بے چینی' بدامنی اور ڈر کی کیفیات کو فروغ ملے اورلوگوں کی عزت وآبرواور جان ومال کو خطرہ محسوس ہو' دہشت گرد کہلاتے

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms02-08 jihad and terrism.inp 8/22/2014 4:41 PM PAGE 3 (1,1)

ہیں' اور ان کے لیے اسلام نے عبرتناک سزائیں مقرر کی ہیں۔ مثلاً قتل' زنا بالجبر' ڈکیتی' چوری' آتش زنی' تخریب کاری اور بم دھماکے وغیرہ ایسے جرائم ہیں جو کسی بھی معاشرے کے امن وسکون کو ختم کرتے ہوئے خوف وڈر کے حالات پیدا کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَاَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ﴾ (المائدۃ:۳۳)

''سوا اِس کے نہیں سزا اُن لوگوں کی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں کہ ان کو بے دردی سے قتل کیا جائے' یا ان کو سولی چڑھایا جائے' یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیے جائیں' یا ان کو ملک سے نکال دیا جائے''۔

اس آیۂ مبارکہ میں ان لوگوں کو جو کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں' دہشت گرد کہا گیا ہے اور ان کے لیے چار عبرت ناک سزاؤں میں سے ایک سزا مقرر کی گئی ہے۔ اب یہ اسلامی عدالت کے قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ مجرم اور اس کے جرم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے ان چار سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا تجویز کر سکتا ہے۔ اسلام تو دہشت گردی کے خاتمے کے لیے احکامات جاری کرتا ہے' چہ جائیکہ اس کی تعلیمات (جہاد) کو دہشت گردی قرار دیا جائے۔

جہاد و دہشت گردی میں فرق

جہاد کا مقصد امنِ عالم کا قیام ہے۔ دنیا سے ظلم وستم کو ختم کر کے اسلام کے عادلانہ نظام کو قائم کرنا جہاد کے اوّلین مقاصد میں شمار ہوتا ہے۔ ظلم چاہے مسلمانوں پر ہو یا غیر مسلموں پر' اسلام ظلم کی حکومت کو برداشت نہیں کرتا' اور یہ بات بھی قطعی طور پر طے ہے کہ جہاں کفر ہوگا' جہاں شرک ہوگا وہاں ظلم ہوگا۔ اس لیے اسلام کی جنگ اصل میں کفر و شرک کے خلاف نہیں بلکہ اس ظلم کے خلاف ہے جو کہ کفر و شرک کا نتیجہ ہے اور اسلام اس ظالمانہ نظام سے نوعِ انسانی کو پُر اَمن دنیا کی طرف لے آنا چاہتا ہے' جبکہ دہشت گردی کی تعریف ہی امن کو ختم کرنا اور ظلم کو برپا کرنا ہے۔ مختصر الفاظ میں اگر ہم اپنی بات کا خلاصہ نکالیں تو ان

الفاظ میں نکلے گا کہ جہاد ظلم وستم اور خوف وہراس کے خاتمے کا نام ہے' جبکہ دہشت گردی ظلم وستم اور خوف وہراس برپا کرنے کا نام ہے۔

دہشت گرد کون؟

دنیا کے نقشے پر اگر ہم نگاہ دوڑائیں تو ایک انچ زمین بھی ایسی نہ ملے گی جہاں پر مسلمان افواج کا قبضہ ہو اور غیر مسلموں پر ظلم وستم ہو رہا ہو۔ لیکن ایسے بہت سارے اسلامی ممالک آپ کو مل جائیں گے جہاں غیر مسلم ریاستوں کی منظّم فوجیں قبضہ کیے بیٹھی ہیں' اور مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ افغانستان ہو یا عراق' کشمیر ہو یا فلسطین' ہر جگہ مسلمان ہی ظلم اور دہشت گردی کا شکار ہیں۔

۞ ۞ ۞

اسلامی نظامِ زندگی

مسلمان کا طرزِ حیات (۴۵)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

''مِنھاجُ المُسلم'' کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

ایک ضروری وضاحت

قارئین میثاق بخوبی جانتے ہیں کہ میثاق نہ تو کسی فقہی مسلک کا ترجمان ہے اور نہ ہی اس کا حلقۂ قارئین کسی خاص مسلک کے حاملین تک محدود ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ سے عالم عرب کے معروف عالمِ دین علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی کتاب ''مِنھاج المُسلم'' کا اردو ترجمہ میثاق کے صفحات میں بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ اس کتاب کا انتخاب کسی مسلکی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی جامعیت کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ ادارۂ میثاق کا فاضل مؤلف کے فقہی مسلک سے کلی اتفاق ضروری نہیں۔

گزشتہ چند ماہ کے شماروں میں ''مِنھاج المُسلم'' کی ''کتاب العبادات'' کا آٹھواں باب شائع ہو رہا ہے جو نماز کے مسائل پر مشتمل ہے۔ ان میں بعض مسائل فقہ حنفی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ لہٰذا فقہ حنفی سے تعلق رکھنے والے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ان مسائل کے بارے میں مزید معلومات کے لیے فقہ حنفی کی کتب بھی اپنے مطالعے میں رکھیں۔ (ادارہ)

E:\Ms-2005\Meesaaq_PdF_2005\meesaq september05\minhaj55.inp 8/22/2014 4:41 PM PAGE 1 (1,1)

کتاب العبادات
آٹھواں باب

نماز (مسلسل)

۱۰) نمازِ جمعہ

ا) نمازِ جمعہ کا حکم:

جمعہ کی نماز واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ط﴾ (الجمعۃ:۹)

''اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت ترک کر دو''۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَیَنْتَھِیَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِھِمُ الْجُمُعَاتِ اَوْ لَیَخْتِمَنَّ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ، ثُمَّ لَیَکُوْنُنَّ مِنَ الْغَافِلِیْنَ))[۱]

''لوگوں کو جمعے ترک کرنے سے باز آجانا چاہیے' ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ضرور مہر لگا دے گا' پھر وہ ضرور اہل غفلت میں شامل ہو جائیں گے''۔

نیز فرمایا:

((اَلْجُمُعَۃُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فِیْ جَمَاعَۃٍ اِلَّا اَرْبَعَۃً : عَبْدٌ مَمْلُوْکٌ اَوِ امْرَاَۃٌ اَوْ صَبِیٌّ اَوْ مَرِیْضٌ))[۲]

''ہر مسلمان پر باجماعت جمعہ ادا کرنا لازمی حق ہے سوائے چار افراد کے: مملوک غلام' یا عورت' یا بچہ یا بیمار''۔

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب التغلیظ فی ترک الجمعۃ۔

(۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' تفریع ابواب الجمعۃ' باب الجمعۃ للملوک والمرأۃ۔ شیخ ناصر الدین الالبانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ (ارواء الغلیل ۳/۵۴)

ب) نمازِ جمعہ کی حکمتیں:

نمازِ جمعہ کی مشروعیت میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ایک حکمت یہ ہے کہ اس طریقے سے ایک گاؤں یا شہر کے وہ تمام مکلّف افراد جو کسی ذمہ داری کو اٹھا سکتے ہیں' ہر ہفتے کی ابتداء میں ایک جگہ جمع ہوں تاکہ مسلمان فرمانروا ان کے دین اور ان کی دنیا کی بہتری کے لیے جو فیصلے کرتا ہے' انہیں معلوم ہو جائیں۔

اِس میں یہ بھی حکمت ہے کہ لوگ اللہ کی ترغیبات اور تنبیہات سنیں' اطاعت گزاروں کے لیے اللہ کے وعدے اور نافرمانوں کے لیے اللہ کی سزائیں ان کو معلوم ہوں' جس سے ان میں اپنے فرائض ادا کرنے کا داعیہ پیدا ہو اور وہ پورا ہفتہ اپنے فرائض پوری ہمت اور احتیاط سے انجام دے سکیں۔

جو شخص جمعہ کی شروط اور اس کی خصوصیات پر غور کرے گا اس کے سامنے یہ حکمت بالکل واضح ہو جائے گی۔ جمعہ کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ آبادی میں پڑھا جائے' مسلمانوں کی ایک جماعت اس میں حاضر ہو' مسجد میں ہو' ایک ہی بڑی مسجد میں ادا کیا جائے۔خطبہ دیا جائے' خطبہ دینے والا خلیفۃ المسلمین یا مقامی حکمران ہو۔خطبہ کے درمیان بات چیت کرنا حرام ہے۔غلام' عورت' بچے اور بیمار پر حاضری ضروری نہیں' کیونکہ یہ لوگ مکمل طور پر مکلّف نہیں۔ اس لیے کہ جو ذمہ داریاں سونپی جانی مقصود ہیں وہ انہیں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

ج) جمعہ کے دن کی فضیلت:

جمعہ کا دن ایک عظیم اور فضیلت والا دن ہے جو تمام دنوں سے افضل ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ ' فِيْهِ خُلِقَ آدَمُ ' وَفِيْهِ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَفِيْهِ اُخْرِجَ مِنْهَا' وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ))(۱)

''وہ دن جن میں سورج طلوع ہوتا ہے' ان میں سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی' اسی دن انہیں جنت میں داخل کیا گیا' اسی دن انہیں وہاں سے نکالا گیا' اور قیامت بھی جمعہ کے دن ہی قائم ہوگی''۔

لہٰذا اللہ کی عطا کردہ اس عظمت کے پیشِ نظر اس دن کی تعظیم کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس دن

(۱)صحیح مسلم' کتاب الجمعة' باب فضل یوم الجمعة۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\minhaj35.inp 8/22/2014 4:41 PM PAGE 2 (1,1)

زیادہ نیکیاں کرنے کی کوشش کی جائے اور تمام گناہوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

د) جمعہ کے آداب واعمال:

① جو شخص جمعہ پڑھنے آئے اسے چاہیے کہ غسل کر کے آئے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((غُسۡلُ الۡجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُحۡتَلِمٍ)) (۱)

''جمعہ کے دن کا غسل ہر بالغ پر واجب ہے''۔

② صاف ستھرے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((عَلٰی کُلِّ مُسۡلِمٍ الۡغُسۡلُ یَوۡمَ الۡجُمُعَةِ ' وَیَلۡبَسُ مِنۡ صَالِحِ ثِیَابِهٖ وَاِنۡ کَانَ لَـهٗ طِیۡبٌ مَسَّ مِنۡهُ)) (۲)

''ہر مسلمان کے لیے جمعہ کے دن نہانا ضروری ہے۔ اور وہ اچھے کپڑے پہنے' اگر خوشبو میسر ہو تو لگائے''۔

③ جمعہ کے لیے سویرے مسجد میں پہنچ جانا۔ یعنی جمعہ کا وقت شروع ہونے سے کچھ وقت پہلے چلا آئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ اغۡتَسَلَ یَوۡمَ الۡجُمُعَةِ غُسۡلَ الۡجَنَابَةِ ثُمَّ رَاحَ فِی السَّاعَةِ الۡاُوۡلٰی فَکَاَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً ' وَمَنۡ رَاحَ فِی السَّاعَةِ الثَّانِیَةِ فَکَاَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً ' وَمَنۡ رَاحَ فِی السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَکَاَنَّمَا قَرَّبَ کَبۡشًا اَقۡرَنَ' وَمَنۡ رَاحَ فِی السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَکَاَنَّمَا قَرَّبَ دَجَاجَةً ' وَمَنۡ رَاحَ فِی السَّاعَةِ الۡخَامِسَةِ فَکَاَنَّمَا قَرَّبَ بَیۡضَةً' فَاِذَا خَرَجَ الۡاِمَامُ حَضَرَتِ الۡمَلَائِکَةُ یَسۡتَمِعُوۡنَ الذِّکۡرَ)) (۳)

''جس شخص نے جمعہ کے دن غسلِ جنابت کیا (۴) ' پھر پہلی ساعت میں (مسجد میں)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب فضل الغسل یوم الجمعة۔ وصحیح مسلم' کتاب الجمعة' باب الطیب والسواك یوم الجمعة۔

(۲) سنن ابی داوٗد **(یہ حدیث اس سے مختلف الفاظ کے ساتھ صحیحین میں بھی موجود ہے) دیکھیے:** صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب الطیب للجمعة۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب فضل الجمعة۔

(٤) **یعنی خوب اچھی طرح غسل کیا جس طرح غسل جنابت کیا جاتا ہے۔ اس حدیث کے ظاہر معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں جیسے کہ بعض احادیث میں اشارہ ملتا ہے۔**

چلا گیا' اس نے گویا اللہ کی راہ میں ایک اونٹ پیش کیا' اور جو دوسری ساعت میں گیا وہ ایسا ہے گویا اس نے ایک گائے دی' اور جو تیسری ساعت میں گیا وہ ایسا ہے گویا اس نے ایک سینگوں والا مینڈھا (اللہ کی راہ میں) دیا' اور جو چوتھی ساعت میں گیا اس نے گویا ایک مرغی پیش کی' اور جو پانچویں ساعت میں گیا اس نے گویا ایک انڈا صدقہ کیا۔ پھر جب امام (خطبہ دینے کے لیے) نکل آتا ہے تو فرشتے نصیحت (خطبہ) سننے کے لیے آ جاتے ہیں۔''

④ جب مسجد میں آ جائے تو کچھ نہ کچھ نماز پڑھ لے' خواہ چار رکعتیں پڑھے یا زیادہ۔ آنحضورﷺ نے فرمایا:

((لَا یَغْتَسِلُ رَجُلٌ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَیَتَطَهَّرُ بِمَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَیَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهٖ اَوْ یَمَسُّ مِنْ طِیْبِ بَیْتِهٖ ثُمَّ یَخْرُجُ فَلَا یُفَرِّقُ بَیْنَ اثْنَیْنِ ثُمَّ یُصَلِّیْ مَا کُتِبَ لَهٗ ثُمَّ یُنْصِتُ اِذَا تَکَلَّمَ الْاِمَامُ اِلَّا غُفِرَ لَهٗ مَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰی مَا لَمْ تُغْشَ الْکَبَائِرُ))(۱)

''جو شخص جمعہ کے دن غسل کرتا ہے' اور جتنی ہو سکے صفائی کرتا ہے' تیل وغیرہ لگاتا ہے یا گھر میں موجود خوشبو لگاتا ہے' پھر مسجد کی طرف چلا جاتا ہے۔ (مسجد میں بیٹھتے وقت) دو آدمیوں کے درمیان جدائی نہیں کرتا(۲)' پھر جو نماز اس کی قسمت میں ہے پڑھتا ہے (یعنی حسب توفیق چند رکعات نماز ادا کرتا ہے)' پھر جب امام بات کرتا ہے (خطبہ دیتا ہے) تو یہ شخص توجہ سے اس کی بات سنتا ہے تو اس کے ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں' جب تک کبائر کا ارتکاب نہ کیا جائے۔''

⑤ جب امام خطبہ دینے کے لیے آ جائے تو بات چیت سے رک جانا چاہیے اور بے فائدہ حرکات سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ مثلاً کنکریوں اور تنکوں وغیرہ کو بلاضرورت چھیڑنا۔ فرمانِ نبویؐ ہے:

((اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِکَ اَنْصِتْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ))(۳)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب لا یفرق بین اثنین یوم الجمعة۔ **اس میں یہ لفظ نہیں:** ''جب تک کبائر کا ارتکاب نہ کیا جائے''۔

(۲) یعنی جہاں جگہ ملتی ہے بیٹھ جاتا ہے' دو آدمیوں کے درمیان زبردستی گھس کر جگہ نہیں بناتا۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب الجمعة' باب فی الانصات یوم الجمعة فی الخطبة۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_PdF_2005\meesaq september05\minhaj55.inp 8/22/2014 4:41 PM PAGE 3 (1,1)

''جمعہ کے دن جب امام خطبہ دے رہا ہو (اُس وقت) اگر تو نے اپنے ساتھی سے کہا ''خاموش!'' تو تو نے لغو حرکت کی۔''

ایک حدیث میں ہے:

((وَمَنْ مَسَّ الْحَصَى فَقَدْ لَغَا))[1]

''اور جس نے کنکریوں کو ہاتھ لگایا اس نے فضول کام کیا۔''

⑥ جب نمازی اُس وقت مسجد میں آئے جب امام خطبہ دے رہا ہو تو تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ہلکی سی پڑھ لے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((اِذَا جَاءَ اَحَدُکُمْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ فَلْیَرْکَعْ رَکْعَتَیْنِ وَلْیَتَجَوَّزْ فِیْهِمَا))[2]

''تم میں سے کوئی جب جمعہ کے دن مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعتیں پڑھ لے اور انہیں مختصر پڑھے''۔

⑦ بیٹھے ہوئے افراد کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھنا اور دو شخصوں کے درمیان فاصلہ پیدا کر کے وہاں بیٹھنا مکروہ ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو لوگوں کی گردنیں پھلانگتے دیکھا تو فرمایا:

((اِجْلِسْ فَقَدْ آذَیْتَ))[3]

''بیٹھ جاؤ۔ تم نے (نمازیوں کو) تکلیف پہنچائی ہے''۔

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((فَلَا یُفَرِّقُ بَیْنَ اثْنَیْنِ))[4]

''اور وہ دو آدمیوں میں جدائی نہیں کرتا''۔

⑧ جب اذان ہو جائے تو خرید و فروخت حرام ہو جاتی ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا

---

(١) صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب فضل من استمع وانصت فی الخطبۃ **(صرف پہلا فقرہ)**۔ وسنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، ابواب الجمعۃ، باب فضل الجمعۃ۔ **اس روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''جس نے لغو حرکت کی اسے اس جمعہ میں کچھ نہیں ملے گا (یعنی ثواب نہیں ملے گا)''۔**

(٢) صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب التحیۃ والامام یخطب۔

(٣) سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، ابواب الجمعۃ، باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ۔

(٤) **حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔**

ارشاد ہے:

﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ﴾ (الجمعة: ۹)

''جب جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت ترک کر دو۔''

⑨ جمعہ کو دن یا رات کے وقت سورۃ الکھف کی تلاوت مستحب ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَرَاَ سُوْرَةَ الْكَهْفِ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ اَضَاءَ لَهٗ مِنَ النُّوْرِ مَا بَیْنَ الْجُمُعَتَیْنِ)) [۱]

''جس نے جمعہ کے دن سورۃ الکھف پڑھی اس کے لیے جمعہ سے جمعہ تک نور روشن رہتا ہے''۔

⑩ بکثرت درود شریف پڑھنا۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَكْثِرُوْا عَلَیَّ مِنَ الصَّلَاةِ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلَیْلَةَ الْجُمُعَةِ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ كُنْتُ لَهٗ شَهِیْدًا وَشَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ)) [۲]

''جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات مجھ پر بہت زیادہ درود پڑھا کرو۔ جو شخص یہ عمل کرے گا' قیامت کے دن میں اس کے حق میں گواہی دوں گا اور شفاعت کروں گا۔''

⑪ اس دن بکثرت دعا مانگنی چاہیے۔ کیونکہ اس دن میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ اس وقت مانگی ہوئی دعا اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ فِی الْجُمُعَةِ لَسَاعَةً لَا یُوَافِقُهَا مُسْلِمٌ یَسْاَلُ اللّٰهَ فِیْهَا خَیْرًا اِلَّا اَعْطَاهُ

---

(۱) رواه البیهقی فی "الدعوات الکبیر" (بحواله مشکوٰة المصابیح)۔ والمستدرك للحاكم' كتاب فضائل القرآن' باب فضيلة سورة الكهف بلفظ: مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْكَهْفِ كَمَا اُنْزِلَتْ كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَيْسَ فِيْهِ ذِكْرُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ۔ سنن الدارمی میں یه حدیث ان الفاظ کے ساتھ ھے: ((مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْكَهْفِ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اَضَاءَ لَهٗ مِنَ النُّوْرِ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ)) (سنن الدارمی' كتاب فضائل القرآن' باب فی فضل سورة الكهف)

(۲) رواه البیهقی باسناد حسن

E:\Ms-2005\Meesaaq_PdF_2005\meesaq september05\minhaj55.inp 8/22/2014 4:41 PM PAGE 4 (1,1)

اِیَّاہُ)) (۱)

’’یقیناً جمعہ کے دن ایک گھڑی ہے‘ کوئی مسلمان اس گھڑی اللہ تعالیٰ سے جو بھلائی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا فرما دیتے ہیں۔‘‘

بعض روایات کے مطابق قبولیت کا یہ وقت امام کے خطبہ کے لیے نکلنے سے لے کر نماز سے فارغ ہونے تک ہے۔ایک قول کے مطابق وہ عصر کے بعد ہے۔(۲)

۶) جمعہ کے وُجوب کی شرطیں

① مرد ہونا: عورتوں پر نمازِ جمعہ کی حاضری واجب نہیں۔

② آزاد ہونا: غلام پر جمعہ واجب نہیں۔

③ بالغ ہونا: بچے پر جمعہ کی حاضری واجب نہیں۔

④ تندرست ہونا: اگر کوئی شخص بیماری کی وجہ سے جمعہ کی نماز میں حاضر نہیں ہو سکتا ہو تو اس پر جمعہ فرض نہیں۔

⑤ اقامت: مسافر پر جمعہ لازمی نہیں۔

ان شرطوں کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ہے:

((اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فِیْ جَمَاعَةٍ اِلَّا اَرْبَعَةً : عَبْدٌ مَمْلُوْکٌ اَوِ امْرَاَةٌ اَوْ صَبِیٌّ اَوْ مَرِیْضٌ))(۳)

’’جمعہ (کی حاضری) ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ لازم حق ہے‘ سوائے چار افراد کے: مملوک غلام‘ عورت‘ بچہ اور بیمار۔‘‘

نیز ارشاد ہے:

((مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَعَلَیْهِ الْجُمُعَةُ یَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلَّا مَرِیْضًا اَوْ مُسَافِرًا اَوِ امْرَاَةً اَوْ صَبِیًّا اَوْ مَمْلُوْکًا)) (٤)

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الجمعة‘ باب فی الساعة التی یوم الجمعة۔ **ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ’’......اور وہ کھڑا نماز پڑھ رہا ہو......‘‘**

(۲) **عصر کے بعد والی حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اور جس حدیث میں خطبہ اور جمعہ شروع ہونے سے نماز ہونے کے درمیان کا ذکر ہے وہ ضعیف ہے۔ دیکھئے:** سنن ابی داوٗد‘ کتاب الصلاة‘ تفریع ابواب الجمعة‘ باب الاجابة فی ایة ساعة ھی فی یوم الجمعة۔

(۳) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الصلاة‘ ابواب الجمعة‘ باب الجمعة للمملوك والمرأة۔

(٤) سنن البیھقی‘ کتاب الجمعة‘ باب من لا تلزمه الجمعة۔ **اس کی سند ضعیف ہے۔**

''جو شخص اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر جمعہ کے دن جمعہ پڑھنا لازم ہے' سوائے مریض' مسافر' عورت' بچے اور غلام کے''۔

جن افراد پر جمعہ واجب نہیں' ان میں سے اگر کوئی شخص جمعہ میں حاضری دے اور امام کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کرلے تو اس کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اس کے بعد اسے ظہر کی نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

د) جمعہ کی صحت کی شروط:

① **بستی**: یعنی صحرا میں یا سفر میں جمعہ پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جمعہ صرف شہروں اور بستیوں میں پڑھا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے صحرا نشین خانہ بدوشوں کو جمعہ قائم کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اسی طرح سفر کے دوران جمعہ کی ادائیگی آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں' حالانکہ آپ ﷺ بکثرت سفر کرتے رہتے تھے۔

② **مسجد**: یعنی جمعہ کی نماز صرف مسجد کی عمارت یا صحن ہی میں ادا کی جاسکتی ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ مسلمان شدید سردی یا گرمی کے ضرر سے محفوظ رہیں۔

③ **خطبہ**: خطبہ کے بغیر جمعہ کی نماز درست نہیں' کیونکہ جمعہ کو خطبہ ہی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

ز) آبادی سے دور رہنے والوں پر جمعہ فرض نہیں

جس شہر میں جمعہ پڑھا جاتا ہو' جو شخص اس سے تین میل سے زیادہ دُور رہتا ہو اُس پر جمعہ کی نماز فرض نہیں۔ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((اَلْجُمُعَةُ عَلٰى كُلِّ مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ))[1]

---

(۱) اسے ابوداؤد اور دار قطنی نے روایت کیا ہے' اور اس کی سند ضعیف ہے۔ امام احمدؒ' امام مالک اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے کہ جہاں تک جمعہ کی اذان سنائی دیتی ہے وہاں کے لوگوں کی جمعہ کے لیے حاضری ضروری ہے۔ اس کی دلیل صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جس میں ایک نابینا صحابیؓ نے حضور ﷺ سے نماز باجماعت سے رخصت طلب کی تھی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا آپ اذان سنتے ہیں؟'' اس سے یہ نکلتا ہے کہ اگر انہیں اذان کی آواز نہ آتی تو نماز باجماعت میں حاضری ان کے لیے ضروری نہ ہوتی۔ دیکھئے: سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' ابواب الجمعۃ' باب من تجب علیہ الجمعۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ' باب یجب اتیان المسجد علی من سمع النداء۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_PdF_2005\meesaq september05\minhaj55.inp 8/22/2014 4:41 PM PAGE 5 (1,1)

”جمعہ ہر اُس شخص پر لازم ہے جو اذان سنتا ہو۔“

اور مؤذن کی آواز عام طور پر تین میل سے دُور نہیں جاتی۔

ح) جسے جماعت کی ایک رکعت ملے

اگر کسی شخص کو جمعہ کی نماز میں سے جماعت کے ساتھ صرف ایک رکعت ملے تو اسے چاہیے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک اور رکعت پڑھ لے۔ اس کے لیے یہی کافی ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ اَدْرَکَ رَکْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ اَدْرَکَ الصَّلَاةَ))(۱)

”جس کو نماز میں سے ایک رکعت مل گئی اسے (پوری) نماز مل گئی۔“

لیکن جس کو ایک رکعت سے بھی کم ملے‘ مثلاً وہ سجدہ وغیرہ میں امام کے ساتھ ملے تو اسے ظہر کی نیت کرنی چاہیے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد چار رکعت نماز مکمل کرنی چاہیے۔

ط) ایک شہر میں ایک سے زیادہ مسجدوں میں جمعہ

اگر پہلی مسجد میں گنجائش نہ رہے اور اس میں توسیع بھی ممکن نہ ہو تو پھر شہر کی کسی اور مسجد یا مسجدوں میں بھی نمازِ جمعہ ادا کی جاسکتی ہے۔

ی) نمازِ جمعہ کا طریقہ

جمعہ کی نماز کا طریقہ یہ ہے کہ سورج ڈھلنے کے بعد امام مسجد میں آئے اور منبر پر چلا جائے۔ وہ لوگوں کو سلام کہے۔ جب وہ منبر پر بیٹھ جائے تو مؤذن اس طرح اذان کہے جس طرح ظہر کی اذان کہی جاتی ہے۔ جب اذان ہو چکے تو امام اٹھ کر لوگوں کو خطبہ دے۔ خطبہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے اور اللہ کے بندے اور رسول محمد ﷺ پر درود پڑھے۔ پھر بلند آواز سے لوگوں کو وعظ ونصیحت کرے۔ جن کاموں کا اللہ نے اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے امام بھی لوگوں کو انہی کاموں کا حکم دے‘ اور جن کاموں سے اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے ان کاموں سے منع کرے اور ترغیب وترہیب سے کام لے۔ اور اللہ کے وعدہ ووعید کا بیان کرے۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جائے۔ اس کے بعد اٹھ کر دوسرا خطبہ اسی لب ولہجہ اور صوت وآہنگ سے مکمل کرے۔ خطبہ زیادہ لمبا نہ کرے۔

(۱) صحیح البخاری۔ وصحیح مسلم‘ کتاب المساجد‘ باب من ادرك ركعة من الصلاة فقد ادرك تلك الصلاة۔

انداز ایسا ہو جیسے کسی لشکر سے خوف دلایا جا رہا ہے۔ دوسرے خطبہ سے فارغ ہو کر منبر سے نیچے اترے اور مؤذن اقامت کہہ دے۔ امام لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائے۔ اس میں قراءت جہری ہونی چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ یا ایسی ہی کوئی اور سورت پڑھے۔[1]

(۱) صحیح مسلم میں سورۃ الجمعۃ اور سورۃ المنافقون کا بھی ذکر آتا ہے۔ کتاب الجمعة، باب ما یقرأ بعد الفاتحة۔

اذان میں ترجیع اور اقامت کے الفاظ

مولانا محمد رمضان پھلپوٹو کے جواب میں مولانا عطاء اللہ ساجد کا مراسلہ

محترم المقام جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی
مدیر مسئول ماہنامہ میثاق لاہور
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امابعد!

ماہنامہ ''میثاق'' ایک مؤقر رسالہ ہے' جو معتدل اسلامی سوچ کا حامل ہے۔ اس معتدل فکر کی وجہ سے اس کا حلقۂ قارئین کسی خاص مسلک کے حاملین تک محدود نہیں' کیونکہ اس کا مشن تمام اسلامی مسالک کے درمیان ہم آہنگی اور رواداری کو فروغ دینا ہے۔

''میثاق'' میں ایک طویل عرصہ سے عرب کے معروف عالمِ دین الشیخ ابوبکر جابر الجزائری کی کتاب ''منہاج المسلم'' کا ترجمہ قسط وار چھپ رہا ہے (جس کا ترجمہ راقم الحروف نے کیا ہے)۔ اگست ۲۰۰۵ء کے شمارے میں سندھ سے مولانا محمد رمضان پھلپوٹو صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے' جس میں محترم مولانا نے خفگی کا اظہار فرمایا ہے۔ میں اس بارے میں چند گزارشات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے توجہ فرمائیں گے۔

محترم! فقہائے کرام کے اختلافات شروع سے موجود رہے ہیں۔ تمام مدارس میں مختلف مسالک کی فقہ پڑھائی جاتی ہے۔ خود فقہ حنفی میں امام ابوحنیفہؒ سے ان کے عظیم شاگردوں امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا اختلاف ایک واضح حقیقت ہے۔ متعدد مسائل میں صاحبینؒ کے قول کو امام صاحبؒ کے قول پر ترجیح دی جاتی ہے' اور اسے ہرگز کسی محترم شخصیت کی تنقیص شمار نہیں کیا جاتا۔ ایک دینی مدرسہ کے استاد سے قدوری اور ہدایہ وغیرہ کی یہ ابحاث پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ اگر شیخ الجزائری نے بعض مسائل میں کسی ایسے موقف کو ترجیح دے دی جو برادرانِ حنفیہ کے موقف سے مختلف ہے تو اس پر اس قدر جذباتی انداز سے اظہار کم از کم ایک عالم دین کے قلم سے ناقابلِ فہم ہے' جیسے انہوں نے فرمایا ہے کہ: ''جماعتِ احناف کی دل آزاری کی گئی ہے''۔ جس کے نتیجے میں محترم مولانا کو ''رنج والم اور افسوس و

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms12-08 khatoot ataullah sajid.inp 8/22/2014 4:45 PM PAGE 1 (1,1)

تکدر کے ملے جلے تأثرات سے گزرنا پڑا''۔اور''جب اس نے اور شدت اختیار کی تو یہ دکھ اور درد قلم وقرطاس پر بکھر گیا''۔ پھر اس دکھ کا اظہار اس طرح ہوا کہ کتاب کے محترم مصنف کا نام''جابر الجزائری'' فرمایا گیا۔اور نام کے احترام کے مظہر کسی ایک لفظ کے استعمال کی بھی گنجائش پیدا نہ ہوسکی۔ایک عالمِ دین کے قلم سے دوسرے عالمِ دین کا نام اس انداز سے لیا جانا تعجب خیز ہے۔مناسب تھا کہ ادارہ''میثاق'' کی طرف سے حاشیہ میں حنفی مسلک بھی بیان کردیا جاتا' جیسے پہلے بھی بعض قسطوں میں ہوا ہے۔لیکن اگر اس قسط میں کسی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا تو یہ کوئی اتنا بڑا حادثہ نہیں' جتنا مولانا محترم کے مراسلے سے محسوس ہوتا ہے۔ راقم الحروف سے یہ غلطی ہوئی کہ ان مسائل پر یہ حاشیہ نہیں دے سکا کہ اذان اور اقامت حدیث سے دونوں طرح (اکہری اور دوہری) ثابت ہے۔اس پر مجھے افسوس رہے گا۔

مضمون کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ محترم مراسلہ نگار کا مقصد مسائل کی تحقیق نہیں' بلکہ صرف ایک خاص موقف کو نمایاں کرنا ہے۔ (اللہ کرے میرا یہ گمان غلط ہو)

اذان میں ترجیع

اذان میں ترجیع کے عنوان کے تحت محترم نے فرمایا ہے:''احناف کا استدلال حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت سے ہے......الخ ''۔لیکن افسوس' جناب نے آدھی حدیث نقل فرمائی ہے' جس میں بلاترجیع اذان مذکور ہے' لیکن اسی حدیث کا دوسرا حصہ حذف کردیا ہے جس سے اکہری اقامت کا ثبوت ملتا ہے۔اگر آپ کے نزدیک یہ حدیث صحیح اور قابل استدلال ہے تو پوری حدیث کو تسلیم کیجیے' ورنہ پوری حدیث کو ضعیف قرار دیجیے۔ مذکورہ بالا حدیث جو سنن ابی داؤد کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے' سنن ابی داؤد ہی میں اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں: ثُمَّ اسۡتَأۡخَرَ عَنِّیۡ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ' ثُمَّ قَالَ : ثُمَّ تَقُوۡلُ اِذَا اَقَمۡتَ الصَّلَاۃَ : اَللّٰہُ اَکۡبَرُ اللّٰہُ اَکۡبَرُ' اَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ' اَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰہِ' حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ' حَیَّ عَلَی الۡفَلَاحِ' قَدۡ قَامَتِ الصَّلَاۃُ' قَدۡ قَامَتِ الصَّلَاۃُ' اَللّٰہُ اَکۡبَرُ اَللّٰہُ اَکۡبَرُ' لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ (دیکھئے سنن ابی داؤد کی وہ حدیث جس کا حوالہ مولانا محترم نے دیا ہے)۔حدیث کے اس حصے کا ترجمہ یوں ہے:''پھر وہ (خواب والا آدمی) مجھ سے کچھ دور ہٹ گیا۔پھر کہا:''پھر جب تو نماز کی اقامت کہے تو یوں کہہ......الخ''

دوسری دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ تابعیؒ نے فرمایا:''میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو دو دو الفاظ کے ساتھ اذان اور دو دو الفاظ کے ساتھ اقامت کہتے سنا''۔لیکن اس دلیل سے ترجیع والی

اذان کی نفی نہیں ہوتی۔ اس میں بھی الفاظ دو دو بار ہی کہے جاتے ہیں: اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ دو بار' اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ دو بار' پھر اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ دو بار' پھر اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ دو بار۔ ان میں سے کوئی کلمہ اکٹھے چار بار نہیں کہا جاتا۔ علاوہ ازیں ایک بات قابل توجہ ہے کہ دوہری اذان کے قائلین اکہری اذان کے منکر نہیں' نہ اکہری اقامت کے جواز کی وجہ سے دوہری اقامت کا انکار کرتے ہیں۔ جب کوئی عمل نبیﷺ سے دو طرح ثابت ہو تو صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ دونوں کو درست مانا جائے' کسی ایک کا انکار نہ کیا جائے۔ ایک صحابی کا اکہری اذان کہنا اور دوسرے صحابی کا ترجیع کے ساتھ اذان کہنا' ان میں کوئی تناقض نہیں۔ دونوں سنت ہیں۔

تیسری دلیل جامع ترمذی کے حوالے سے ہے:

((کَانَ اَذَانُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ شَفْعًا شَفْعًا فِی الْاَذَانِ وَالْاِقَامَۃِ))

''نبیﷺ کی اذان اور اقامت دو دو کلمات کے ساتھ ہوتی تھی۔''

اس حدیث کو عمرو بن مرہؒ سے ان کے دو شاگردوں نے روایت کیا ہے۔ ابن ابی لیلیٰؒ نے عمرو بن مرہؒ سے مذکورہ بالا الفاظ نقل کیے ہیں۔ عمرو بن مرہؒ کے دوسرے شاگرد امام شعبہؒ نے اس سند سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ کو خواب میں اذان دکھائی گئی۔ امام ترمذیؒ ابن ابی لیلیٰؒ کی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلی روایت کو غلط قرار دیتے ہیں۔ اس لیے شعبہؒ کی حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: ھذا اصح من حدیث ابن ابی لیلی ''یہ روایت ابن ابی لیلیٰؒ کی روایت سے زیادہ صحیح ہے''۔ (دیکھئے ترمذی کی مذکورہ حدیث)۔

چوتھی دلیل صحیح مسلم کی بلا ترجیع اذان کی ہے' لیکن یہ تو تب پیش کی جائے اگر کوئی بلا ترجیع اذان کا انکار کر رہا ہو۔ ویسے ترجیع والی حدیث بھی صحیح مسلم میں موجود ہے۔ (دیکھئے صحیح مسلم' کتاب الاذان' باب صفۃ الاذان)۔

اقامت کے الفاظ

اس بارے میں محترم مولانا صاحب نے چار احادیث تحریر فرمائی ہیں۔ ان میں سے پہلی حدیث وہی ہے جو اذان کے مسئلہ میں تیسری دلیل کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ اور دیگر احادیث سے بھی دوہری اقامت کا ثبوت ملتا ہے۔ اکہری اقامت کے قائلین کو اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔ ویسے مولانا محترم اپنی پیش کردہ تیسری دلیل پر غور فرمائیں۔ اس میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms12-08 khatoot ataullah sajid.inp 8/22/2014 4:45 PM PAGE 2 (1,1)

عَلَّمَنِی النبیُّ ﷺ اَلْاَذَانَ تِسْعَ عَشْرَۃَ کَلِمَۃً وَالْاِقَامَۃَ سَبْعَ عَشْرَۃَ کَلِمَۃً

’’مجھے نبی ﷺ نے اذان کے انیس کلمات اور اقامت کے سترہ کلمات سکھائے‘‘۔

اس حدیث سے اقامت کے مسئلہ میں تو آپ کی تائید ہوتی ہے‘ لیکن اذان کے مسئلہ میں مشکل پیش آتی ہے‘ کیونکہ اذان کے کلمات ترجیع کے ساتھ ہی انیس بنتے ہیں۔ اس مشکل کا آسان حل یہی ہے کہ صرف آدھی حدیث کو تسلیم کرنے کے بجائے پوری حدیث کو تسلیم کرلیا جائے۔

آپ نے جامع الاصول‘ حدیث ۳۳۵۵ تا ۳۳۵۷ کا حوالہ دیا ہے۔ ان میں یہی واقعہ سنن ابی داؤد شریف اور سنن ترمذی شریف کے حوالے سے درج ہے۔ ان میں حدیث ۳۳۵۷ میں یہ الفاظ ہیں: ’’فَاَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِلَالًا اَنْ یَشْفَعَ الْاَذَانَ وَیُوْتِرَ الْاِقَامَۃَ‘‘ وفی روایۃ: ’’وَاَنْ یُوْتِرَ الْاِقَامَۃَ اِلَّا الْاِقَامَۃَ‘‘۔ ترجمہ یوں ہے: ’’تو رسول اللہ ﷺ نے بلال ؓ کو حکم دیا کہ اذان کے کلمات دو دو بار اور اقامت کے کلمات ایک ایک بار کہیں‘‘ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ: ’’اقامت کے الفاظ ایک ایک بار کہیں سوائے ’’قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ‘‘ کے‘‘۔ جامع الاصول کی حدیث ۳۳۵۸ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس میں حضرت ابومحذورہ ؓ کا بیان ہے کہ ’’نبی ﷺ نے مجھے اذان کا طریقہ سکھایا‘‘۔ اس میں دوہری اذان کے ساتھ دوہری اقامت مذکور ہے۔

دیگر تمام حوالہ جات کے بارے میں عرض ہے کہ دوہری اقامت کا ثبوت اکہری اقامت کی نفی نہیں کرتا۔ دونوں طرح درست ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو اختلافی بنانے کی ضرورت نہیں۔

دو مسائل پر بات کرتے ہوئے معروضات کافی طویل ہوگئی ہیں۔ تیسرے مسئلہ ’’جمع بین الصلاتین‘‘ کے موضوع پر اگر ضرورت محسوس کی گئی تو پھر کسی وقت معروضات پیش کی جا سکتی ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

آخر میں گزارش ہے کہ اگر میری تحریر میں کہیں کوئی ناگوار لفظ آ گیا ہو تو میں مولانا محمد رمضان پھلیوٹو صاحب سے معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے آپ زبان و بیان کے اسلوب کے بجائے مسئلہ پر توجہ فرمائیں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عطاء اللہ ساجد

مبارک کالونی‘ گوجرانوالہ

التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم

تحریر: مولانا گوہر رحمٰنؒ

الجماعۃ اور اس کے التزام کا ذکر احادیث نبویہؐ میں بار بار آیا ہے۔ زیرِ نظر علمی اور تحقیقی مقالے میں التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا گوہر رحمٰنؒ (شیخ القرآن والحدیث جامع اسلامیہ تفہیم القرآن مردان) نے یہ مقالہ ۱۵ مئی ۱۹۹۵ء کو تحریر فرمایا تھا، جو اُن کی کتاب ''تفہیم المسائل'' جلد پنجم میں شامل ہے۔

باعثِ تحریر

مدنیت اور اجتماعیت انسان کی طبیعت اور فطرت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ شریعت کا حکم بھی یہی ہے کہ اجتماعی نظام قائم کیا جائے اور ایک عادل و صالح امیر کی امارت کے تحت زندگی گزاری جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے امیر کی اطاعت سے نکلنے کو جاہلیت قرار دیا ہے اور التزامِ جماعت کا حکم دیا ہے، لیکن تحقیق طلب بات یہ ہے کہ التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور ''الجماعۃ'' کی حقیقت کیا ہے؟ جس سے بالشت برابر علیحدگی بھی ایک مسلمان کو جاہلیت کے دائرے میں لے جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ:

> ''جب ملت اسلامیہ اپنی سرزمین میں خودمختار ہو اور اس کا کوئی حکمران ہو تو ان کے اس عمل سے جو ریاست یا نظمِ سیاسی وجود میں آئے گا وہ ''الجماعۃ'' کہلائے گا۔ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک ہی نظم اجتماعی سے وابستہ ہوں۔...... حدیث کے اس مطلب کی روشنی میں جس کو ہم نے اوپر واضح کیا ہے، یہ حکم (التزامِ جماعت کا حکم) ہمارے ملک میں حکومت پاکستان کے ساتھ وفادار رہنے اور اس کے قوانین کی پابندی کرنے سے پورا ہو جاتا ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتے

(۱) ماہنامہ اشراق، فروری ۱۹۹۴ء، ص ۱۵، ۱۶۔

ہیں کہ حکومتِ پاکستان ہی اس سرزمین کے مسلمانوں کے لیے الجماعۃ ہے''۔[1]

اس نقطۂ نظر کے حاملین اس حکم شرعی کو تو جانتے اور مانتے ہیں کہ:

''حکمران بلاشرط مطاع نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ یہ شرط لگا دی کہ جب تک وہ قرآن و سنت پر عامل ہے اور شریعتِ اسلامیہ کو قانونِ بالا (سپریم لاء) تسلیم کرتا ہے اس وقت تک اس کی اطاعت کی جائے۔...... یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ کفر صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اسلام کے عقائد کا انکار کر دے' بلکہ حکمرانوں کے معاملے میں یہ بھی کفر ہے کہ وہ فصل نزاعات اور قانون سازی میں اللہ کی دی ہوئی شریعت کی خلاف ورزی کریں۔ اللہ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾...... هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾...... هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ (المائدۃ)

''اور جو لوگ اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں جسے اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں......وہی ظالم ہیں......وہی فاسق ہیں''۔[1]

لیکن شریعت کے اس حکم کو جاننے اور ماننے کے باوجود اُن کا نقطۂ نظر یہ بھی ہے جس کا اظہار جماعت اسلامی پاکستان کے سابق امیر جناب میاں طفیل محمد صاحب کے ایک تنقیدی خط کے جواب میں اس طرح کیا گیا ہے:

''شریعت کی رو سے تو کفر بواح کی مرتکب حکومت بھی اُس وقت تک الجماعۃ ہوتی ہے جب تک عامۃ الناس کا اعتماد اسے حاصل ہو اور مسلمان رعایا اس پر مجتمع ہو۔ اس کی اطاعت سے علیحدگی اور تخلف ممنوع ہے''۔

اس تضاد کی توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ:

''التزامِ جماعت کے حکم کی علت اور حکمت نفاذِ دین اور غلبۂ دین نہیں ہے' بلکہ اتفاق و اتحاد کا حصول اور افتراق وانتشار سے تحفظ التزامِ جماعت کی اصل علت ہے''۔ (ایضاً)

التزام جماعت کے مفہوم کے بارے میں ایک مکتب فکر تو یہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی منتخب و معتمد حکومت الجماعۃ ہے' خواہ عادل و صالح ہو یا فاسق و فاجر ہو یا کھلے اور صریح کفر کی مرتکب ہو' جیسی بھی ہو' مگر جب تک اسے عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہے اس وقت تک اس کی اطاعت کرنا اور اس کا وفادار رہنا شریعت کا تقاضی ہے۔ باقی رہیں وہ تنظیمیں اور جماعتیں جو دعوتِ دین' غلبۂ دین اور اقامتِ دین کے لیے بنائی جاتی ہیں وہ اس مکتب فکر کے نزدیک جائز تو ہیں مگر قرآن وسنت میں ایسی جماعتیں بنانے کے لیے نہ کوئی نص موجود

---

(۱) ماہنامہ اشراق' فروری ۱۹۹۴ء' ص ۱۴۔

ہے اور نہ کسی غیر حکومتی جماعت کے التزام واطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ سمع وطاعت سے متعلق تمام نصوص کا تعلق صرف حکومت وقت سے ہے جب کہ وہ عامۃ الناس کی معتمد ہو۔

التزامِ جماعت کے بارے میں دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ حدیث صحیح میں جماعت المسلمین اور اس کے امام کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اس لیے آج سے غالباً ۳۰ سال پہلے کراچی میں جو جماعت المسلمین بنائی گئی تھی اس میں شمولیت اختیار کر لی جائے اور دوسرے ناموں سے فرقے اور جماعتیں نہ بنائی جائیں۔ اس نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ حکومت پاکستان ''الجماعۃ'' ہے اور نہ دوسرے ناموں سے بنائی گئی تنظیمیں اور جماعتیں ''الجماعۃ'' ہیں' بلکہ ''الجماعۃ'' سے مراد جماعت المسلمین ہے۔ التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ جماعت المسلمین اور اس کے امام کی اطاعت کی جائے۔

ان دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان ایک عام مسلمان سخت الجھن کا شکار ہو سکتا ہے۔ میری اس تحریر کا مقصد کسی کے ساتھ مناظرہ کرنا نہیں ہے' بلکہ اپنے علم کی حد تک الجماعۃ اور التزامِ جماعت کے صحیح مفہوم کی تنقیح و تشریح کرنا ہے۔ کفر بواح کی مرتکب حکومت کے خلاف خروج اور مسلح بغاوت کا مسئلہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے' اس لیے اس موضوع پر فی الحال میں اپنی رائے پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا اور دینی سیاسی جماعتوں کے موضوع پر میرا ایک تفصیلی مقالہ میری کتاب ''تفہیم المسائل'' حصہ اوّل میں شامل ہے اور اس موضوع پر میرا ایک مضمون ''فاران'' میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر لکھنے کی اب ضرورت باقی نہیں رہی' کیونکہ میرا نقطۂ نظر قارئین کے سامنے آ چکا ہے۔

اس مضمون میں جن عنوانات پر بحث کی گئی ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) حکومت بالفعل اور حکومت بالحق۔

(۲) اُمّت مسلمہ کے وجود کا مقصد اقامت دین ہے۔

(۳) اُمّت مسلمہ کی نمائندہ حکومت کا مقصد بھی اقامت دین ہے۔

(۴) الجماعۃ سے مراد وہ حکومت ہے جو اقامت دین کا کام کرتی ہو۔

(۵) قرآن وسنت سے منحرف حکومت طاغوت ہے۔

(۶) الجماعۃ بمعنی اہل سنت والجماعت۔

(۷) جماعت المسلمین کا صحیح مفہوم۔

(۸) دینی جماعتیں اہل سنت والجماعۃ کی برادر تنظیمیں ہیں۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ma11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 2 (1,1)

ان آٹھ موضوعات کے ذیلی عنوانات کے تحت اقامت دین کے مفہوم‘ اظہارِ دین کے مفہوم‘ افتراقِ اُمّت کی حدیث کے مفہوم اور اہل سنت والجماعت کے مفہوم پر تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ اِن شاء اللہ ان مباحث کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد الجھن ختم ہو جائے گی اور التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم معلوم ہو جائے گا۔

(۱) حکومت بالفعل اور حکومت بالحق

اصل موضوع پر بحث شروع کرنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے جس کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بعض سکالروں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ ایک حکومت تو وہ ہوتی ہے جو ایک امر واقعہ کے طور پر بالفعل قائم ہوتی ہے اور عملاً لوگ اس کو حکومت وقت کے طور پر تسلیم بھی کرتے ہیں اور اس کے انتظامی اور نظم ونسق سے متعلق قواعد وضوابط کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ مثلاً اس کی سڑکوں‘ ریلوے لائنوں اور ایئر لائنوں پر چلتے ہیں اور ٹریفک کے قواعد کی پابندی کرتے ہیں‘ اس سے اپنا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنواتے ہیں اور اس کو ٹیکس اور دوسرے سرکاری واجبات بھی ادا کرتے ہیں‘ بلکہ اپنے حقوق حاصل کرنے اور تنازعات کا تصفیہ کرانے کے لیے اس کی عدالتوں میں جانے پر بھی اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ ایسی حکومتیں تو آج امریکہ‘ برطانیہ‘ فرانس‘ جرمنی‘ جاپان اور روس میں بھی عملاً قائم ہیں اور ان ممالک کے مسلمان شہری بھی ان کے ملکی قوانین کی پابندی کرتے ہیں اور مباحات کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ان حکومتوں کے انتظامی قواعد وضوابط کی پابندی کرنا شرعاً ممنوع بھی نہیں ہے‘ لیکن کیا صرف بالفعل موجود ہونے اور حکومت وقت ہونے کی وجہ سے ان غیر مسلم حکومتوں کو الجماعۃ کہا جا سکتا ہے جس کا التزام دین کا تقاضا ہے اور جس سے الگ ہونا جاہلیت ہے؟

ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان بھی ان حکومتوں کو الجماعۃ نہیں کہہ سکتا۔ کیوں نہیں کہہ سکتا؟ اس لیے کہ یہ حکومتیں بالفعل تو ہیں مگر بالحق نہیں ہیں۔ قرآن وسنت کی رو سے بالحق حکومت وہ ہوتی ہے جو اللہ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی بالادستی کو نہ صرف یہ کہ اعتقاداً تسلیم کرتی ہو بلکہ عملاً حکومت کا پورا نظام قرآن وسنت کے مطابق چلاتی ہو‘ ورنہ وہ ظالم حکومت ہوگی اور ﴿لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ کے مصداق ظالموں کو حکومت کا حق نہیں ہے۔

اسی طرح پاکستان اور دوسرے بہت سے اسلامی ممالک کے اسمی اور نسلی مسلمانوں کی

حکومتیں بالفعل تو ہیں مگر بالحق حکومتیں نہیں ہیں' اس لیے کہ ان کے حکمران اسماً اور نسلاً مسلمان ہونے کے باوجود عملاً قرآن وسنت کی بالادستی بھی تسلیم نہیں کرتے اور شریعتِ اسلامی کا التزام بھی نہیں کرتے' بلکہ ملک کا نظام سیکولرازم اور لادین سیاست کے اصولوں کے مطابق چلاتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان کو مسلمانوں نے منتخب کیا ہے تو جیسا کہ بعد کی سطور میں وضاحت کی جائے گی' قرآن وسنت کی بالادستی اور التزام سے عملاً منحرف ہو جانے والی حکومت کو بالحق حکومت نہیں کہا جا سکتا اگرچہ اس کو مسلمانوں نے منتخب کیا ہو اور اس کو عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہو۔ ﴿اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾ کا مطلب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں نے اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے یا فریب خوردگی کی وجہ سے یا مفاد پرستی اور خود غرضی کی وجہ سے اگر قرآن وسنت سے منحرف حکومت کو منتخب کرلیا ہو تو وہ بھی حکومت بالحق ہو گی! بالفعل اور بالحق کے اس فرق کو مدّنظر رکھتے ہوئے اب اگلے عنوان پر غور کیجیے!

(۲) اُمّت مسلمہ کے وجود کا مقصد اقامتِ دین ہے

اُمّت مسلمہ وہ عالمی اور آفاقی جماعت ہے جو توحید و رسالت کے عقیدے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ اس جماعت کی فکری قیادت رسالت محمدی یعنی قرآن وسنت کو تاقیامت حاصل ہے اور یہ پوری دنیا میں ایک ہی جماعت ہے۔ اور جو بھی اس جماعت سے باہر ہے وہ دائرۂ اسلام سے بھی خارج ہے' لہٰذا وہ جماعت جس کے التزام کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں رہ سکتا اور اس میں شمولیت کے بغیر دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوسکتا وہ تو ہے اُمّت مسلمہ' لیکن سوال یہ ہے کہ اُمّت مسلمہ کی تشکیل اور اس کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی جماعت مقصد اور ہدف کے تعین کے بغیر نہیں بنائی جاتی۔ اُمّت مسلمہ خود اللہ نے بنائی ہے اور اس کی فکری قیادت و امارت رسالت محمدی کو دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت کا بے مقصد ہونا ناقابل تصور ہے۔ کسی جماعت کا مقصد وہی ہوسکتا ہے جو اس کو بنانے والے نے متعین کیا ہو اور اس جماعت کے ارکان کو اس مقصد کے حصول کے لیے کام کرنے کا حکم دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ:

﴿شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا وَّالَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ وَمَا وَصَّيۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسٰۤى اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۳)

''مقرر کیا ہے اس نے تمہارے لیے وہ دین جس کی وصیت کی تھی اس نے

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2016 4:44 PM PAGE 3 (1,1)

نوح (علیہ السلام) کو اور جس کی وحی کی ہے ہم نے تیری جانب اور جس کی وصیت کی تھی اس نے ابراہیم (علیہ السلام) کو' موسیٰ (علیہ السلام) کو اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو کہ قائم رکھو اس دین کو اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔''

اس آیت میں لَـکُمْ کے مخاطب مسلمان ہیں اور پوری اُمّت مسلمہ ہے۔ ان کو مخاطب کر کے اللہ نے فرمایا ہے کہ تمہاری اس جماعت کا مقصد وجود وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کا مقصد بعثت رہا ہے' اور وہ یہ ہے کہ اقامت دین کا فرض ادا کرتے رہو اور دین کو قائم کرنے اور قائم رکھنے میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ رہو' اختلاف نہ کرو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو' بلکہ سب مل کر دین کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھام لو' اس لیے کہ یہ اقامت دین تمہاری جماعت کے وجود کا مقصد ہے اور اپنے وجود کے مقصد میں افتراق واختلاف کرنا ایک غیر معقول رویہ ہے اور اپنا شیرازہ خود اپنے ہاتھوں سے منتشر کرنے کے مترادف ہے۔ امام ابن جریر (متوفی ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں:

الذی اوصی بہ جمیع ھؤلاء الانبیاء وصیة واحدة وھی اقامة الدین[۱]

''ان سب انبیاء کو اللہ نے جو وصیت کی تھی وہ ایک ہی وصیت تھی اور وہ تھی اقامت دین کی وصیت۔''

یہ بات تو کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ اللہ نے اپنے انبیاء کو جو حکم دیا وہی حکم ان کی اُمتوں کے لیے بھی ہوتا ہے' اِلّا یہ کہ اللہ نے صراحت کے ساتھ فرما دیا ہو کہ یہ حکم نبی کے لیے مخصوص ہے' یا نبی نے کہہ دیا ہو کہ یہ حکم صرف میرے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ:

اختار ھم اللّٰہ لصحبة نبیہ ولاقامة دینہ[۲]

''اللہ نے ان کو اپنے نبی کی رفاقت کے لیے اور اقامت دین کے لیے چن لیا تھا۔''

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں اس اُمّت وسط کا مشن ''شہادتِ حق'' قرار دیا گیا ہے' یعنی یہ کہ وہ اپنے قول وعمل سے حق کی گواہی دے گی اور اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کا عملی نمونہ پیش کرے گی۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۰ میں اس اُمّت کی تشکیل کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بتایا گیا ہے' لیکن چونکہ حق اور معروف سے مراد دین حق کے

---

(۱) جامع البیان عن تاویل آی القرآن' سورۃ الشوریٰ' آیت ۱۳۔

(۲) مشکوٰۃ' کتاب الاعتصام' فصل ثالث۔

فرائض ہیں اور منکر سے مراد منہیات اور سیئات ہیں اس لیے نیکی کو پھیلانا اور برائی کو مٹانا دینِ حق کی شہادت دینا اور اقامتِ دین کا فرض انجام دینا ہے۔

اقامت دین کا مفہوم

شاہ ولی اللہؒ (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے ''اَقِیمُوا الدِّیْنَ'' کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے: ''قائم کنید دین را'' (دین کو قائم کرو) اور اس کی تشریح اپنی دوسری کتاب میں اس طرح کی ہے:

> آنحضرت ﷺ چوں مبعوث شدند برائے کافه خلق اللّٰه با ایشاں معامله ها کردند و تصرفها نمودند برائے هر معامله نواب تعین فرمودندو اهتمام عظیم در هر معامله مبذول داشتند چوں آن معاملات را استقرا نمائیم واز جزئیات بکلیات و از کلیات بکلی واحد که شامل همه باشد انتقال کنیم جنس اعلیٰ آں اقامت دین باشد که متضمن جمیع کلیات است و تحت وے اجناس دیگر باشند[1]
>
> ''آنحضرت ﷺ جب ساری مخلوق کے لیے مبعوث ہوئے تو آپؐ نے لوگوں کے ساتھ مختلف معاملات کیے اور مختلف تدابیر اختیار فرمائیں' ہر معاملے کے لیے اپنے نمائندے اور نائب مقرر فرمائے اور ہر معاملے کو انجام دینے کے لیے بڑا اہتمام فرمایا۔ اگر ہم ان سب معاملات کو معلوم کریں اور جزئیات سے کلیات معلوم کریں اور پھر کلیات سے ایسا واحد کلیہ معلوم کریں جو تمام کلیات کا جامع ہو تو وہ کلیہ اقامت دین ہی ہوسکتا ہے جو تمام کلیات پر مشتمل ہے اور اس کے تحت دین کے مختلف اجناس (شعبے) آتے ہیں۔''

شاہ ولی اللہؒ کی درج بالا عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمّت کی اصلاح کے لیے جو کام بھی کیے ہیں خواہ وہ اصول وکلیات سے تعلق رکھتے ہوں یا وہ فروع اور جزئیات سے متعلق ہوں' ان سب کا کلمۂ جامعہ اقامت دین ہے۔ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کے نزدیک اقامت دین سے مراد پورے کے پورے دین کو معہ اصول وفروع کے عملاً قائم کرنا ہے' نافذ کرنا ہے اور اس پر عمل درآمد کروانا ہے' صرف پڑھنا پڑھانا اور خود عمل کرنا اقامت دین کا جامع مفہوم نہیں ہے۔

مولانا مودودیؒ (متوفی ۱۳۹۹ھ) نے ترجمہ تو کیا ہے: ''قائم کرو اس دین کو'' مگر

---

(۱) ازالۃ الخفاء' طبع سهيل اكيڈمی لاهور' ص ۲۔

تشریح میں لکھا ہے:

''اس فقرے کا ترجمہ شاہ ولی اللہ نے "قائم کنید دین را" کیا ہے اور شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے ''قائم رکھو دین کو'۔ یہ دونوں ترجمے درست ہیں۔ اقامت کے معنی قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی' اور انبیاء علیہم السلام ان دونوں ہی کاموں پر مامور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم کریں اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو وہاں اسے قائم رکھیں۔ جو چیزیں مادی نہیں بلکہ معنوی ہوتی ہیں ان کے لیے جب قائم کرنے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد اس چیز کی محض تبلیغ کرنا نہیں بلکہ اس پر کماحقہ عمل درآمد کرنا' اسے رواج دینا اور عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو جب دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تھا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں اور دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں' بلکہ یہ بھی تھی کہ پورا دین ان میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے تاکہ اس کے مطابق عمل درآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے''۔ (۱)

مولانا امین احسن اصلاحی نے ترجمہ کیا ہے ''قائم رکھو اِس دین کو' اور تشریح اس طرح کی ہے کہ:

''قائم رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی جو باتیں ماننے کی ہیں وہ سچائی کے ساتھ مانی جائیں' جو کرنے کی ہیں وہ دیانت اور راست بازی کے ساتھ کی جائیں' نیز لوگوں کی برابر نگرانی رکھی جائے کہ وہ اس سے غافل اور منحرف نہ ہونے پائیں اور اس بات کا بھی پورا اہتمام کیا جائے کہ اہل بدعت اس میں کوئی رخنہ نہ پیدا کر سکیں۔'' (۲)

مولانا اصلاحی نے اقامت دین کی جو تشریح کی ہے اپنے حاصل مفہوم کے اعتبار سے وہی تشریح ہے جو شاہ ولی اللہؒ اور مولانا مودودیؒ نے کی ہے کہ دین صرف عقائد و اخلاق کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں ماننے اور کرنے کی ساری چیزیں یعنی اصول و فروع اور جزئیات و کلیات سب شامل ہیں اور اس دین کو قائم رکھنے سے مراد خود بھی عمل کرنا ہے اور دوسروں سے بھی عمل کروانا ہے' لوگوں کو اس سے غافل اور منحرف ہونے سے بچانے کی کوشش کرنا بھی اقامت دین کے مفہوم میں شامل ہے اور دین کو اہل بدعت اور تجدد پسندوں کی رخنہ

---

(۱) تفہیم القرآن' سورۃ الشوریٰ' حاشیہ ۲۰۔

(۲) تدبر قرآن' ج۷' ص ۱۵۳۔

اندازیوں سے محفوظ رکھنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

میں نے جب صحاح اللغات' لسان العرب' مفردات القرآن اور القاموس المحیط کی طرف اس مضمون کے لکھنے کے موقع پر ایک مرتبہ پھر مراجعت کی تو معلوم ہوا کہ ''قائم کرو'' کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے لیکن ائمۂ لغت کی تصریحات اور عربی محاورات کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھنے والا ترجمہ ہے ''قائم رکھو اس دین کو''۔ قدیم مفسرین نے بھی اسی طرح کی تحقیق کی ہے اور جدید مفسرین کی غالب ترین اکثریت نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ لیکن قائم رکھنے کا مطلب بھی وہی ہے جو شاہ ولی اللہ ؒ' مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی نے بیان فرمایا ہے کہ پورے دین کو زندگی کا دستور العمل بناؤ۔ انفرادی زندگی سے تعلق رکھنے والے احکام کو بھی بالکل ٹھیک اور درست حالت میں برقرار رکھو اور دفاعی و جہادی یا عدالتی و معاشرتی شعبوں سے متعلق احکام وقوانین کو بھی بالکل ٹھیک اور درست حالت میں برقرار رکھو اور ان پر کماحقہ عمل درآمد کرو۔

قدیم مفسرین میں امام ابوالحسن ماوردیؒ (متوفی ۴۵۰ھ) نے ''اَقِیْمُوا الدِّیْنَ'' کی ہمہ پہلو تفسیر کی ہے۔ فرماتے ہیں:

> اعملوا به' ادعوا اليه' جاهدوا عليه من عانده[1]
>
> ''اس دین پر عمل کرو' اس کی طرف دعوت دیتے رہو اور اس کے دشمنوں کے مقابلے میں جہاد کرو۔''

دین کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے خود عمل کرنا ضروری ہے' پھر دوسروں کو دعوت دینا اور جہاد کرنا بھی دین کو قائم رکھنے کا لازمی تقاضی ہے۔ مذکورہ بحث سے تو ثابت ہوتا ہے کہ اقامت دین نہ صرف یہ کہ ایک دینی فریضہ ہے بلکہ یہ تو حقیقت میں اُمّ الفرائض ہے' لیکن ہمارے ایک فاضل بھائی لکھتے ہیں:

> ''اس معنی (قائم رکھو) کی رو سے صاف واضح ہے کہ یہ دین کے فرائض میں سے ایک فرض اور اس کے احکام میں سے ایک حکم نہیں ہے کہ اسے فریضۂ اقامت دین قرار دے کر فرائض دینی میں ایک فرض کا اضافہ کیا جائے' بلکہ یہ پورے دین کے متعلق ایک اصولی ہدایت ہے۔ ہر وہ چیز جو قرآن وسنت کی رو سے الدین میں شامل ہے آیۂ زیر بحث میں ہمیں اس کو اپنی زندگی میں برقرار رکھنے کی ہدایت کی گئی

---

(۱) تفسیر الماوردی' طبع بیروت ۱۹۹۲ء' ص ۱۹۷' ج۵۔

ہے‘ لیکن اس لیے نہیں کہ یہ تمام یا ان میں سے کوئی حکم لفظ اَقِیۡمُوا کے مفہوم میں شامل ہے‘ بلکہ اس وجہ سے کہ یہ سب الدِّیۡنَ میں شامل ہیں۔‘‘ (۱)

میں اس فاضل سکالر کو اتنا کم فہم یا کج فہم تو نہیں سمجھتا کہ وہ اقامت دین کو ایک دینی فرض اور ایک دینی حکم اس لیے قرار نہیں دیتا کہ دینی فرائض واحکام الدّین میں شامل ہیں‘ اَقِیۡمُوۡا کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں‘ حالانکہ بات قائم رکھنے اور عمل کرنے کی ہو رہی ہے تو کیا عمل کرنا‘ درست اور برقرار رکھنا بھی اَقِیۡمُوۡا کے مفہوم میں شامل نہیں ہے؟ یہ مفہوم تو آپ نے خود بیان فرمایا ہے!

اگر اس نہج کا کوئی سکالر یہ کہے کہ پورے کے پورے اسلام پر عمل کرنا دینی فرض نہیں ہے‘ بلکہ اپنی طرف سے فرائضِ دینی میں ایک فرض کا اضافہ کرنا ہے‘ اس لیے کہ اسلام کے احکام اُدۡخُلُوۡا کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں‘ یا کوئی دوسرا اُٹھ کر یہ نکتہ آفرینی کرے کہ اللہ کی رسّی کو مل کر تھامنا اور سارے مسلمانوں کا اس پر مجتمع ہونا دینی فرض نہیں ہے‘ اس لیے کہ ’’حَبۡلُ اللّٰہِ‘‘ ’’وَاعۡتَصِمُوۡا‘‘ کے مفہوم میں شامل نہیں ہے‘ یا کوئی تیسرا شخص یہ کہہ دے کے نماز تو دینی فرض ہے مگر اقامت صلوٰۃ دینی فرض نہیں ہے‘ اس لیے کہ نماز صلوٰۃ کے مفہوم میں تو شامل ہے مگر اقامت کے مفہوم میں شامل نہیں ہے‘ تو ایسے سکالروں اور عربیت کے ماہرین کے متعلق معلوم نہیں ہمارے اس فاضل دوست کی رائے کیا ہوگی۔ انہوں نے خود اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ اور وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ کو اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ کی مثال میں پیش فرمایا ہے۔ اگر اقامت صلوٰۃ اور اعتصام بحبل اللہ ان کے نزدیک فرض ہے‘ اور یقیناً فرض ہے‘ تو اقامت دین کیوں فرض نہیں ہے؟ مجھے تو اِن تینوں میں سوائے جزء اور کُل کے اور کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علامہ کے دل ودماغ پر کسی کی غلطی ثابت کرنا اور علم وتحقیق کے اعتبار سے اسے نیچا دکھانا سوار ہو چکا تھا مگر بات بنتی نہیں تھی‘ اس لیے از خود بنانی پڑ گئی۔ واللہ اعلم!

اظہارِ دین کا مفہوم

یہ بات تو واضح ہوگئی کی اقامت دین انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہے اور اسی وجہ سے اُمّت مسلمہ کے وجود کا مقصد بھی اقامت دین ہے‘ لیکن اس بات کی دوسری تعبیر یہ بھی ہے کہ

---

(۱) برھان‘ طبع ۱۹۹۲ء‘ ص ۱۹۔

اُمّت مسلمہ کی تشکیل کا مقصد غلبۂ دین کے لیے جہاد کرنا ہے' اس لیے کہ اس کے نبی کی نبوت کا مقصد اور حکمت غلبۂ دین ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت و رسالت کی علت وحکمت درج ذیل آیات میں وضاحت وصراحت کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے متعین طور پر بتا دی ہے:

﴿هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ (التوبة:۳۳' الصفّ:۹)

''اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اسے ہر دین پر اگرچہ پسند نہ کرتے ہوں اسے مشرک۔''

اَلْهُدٰی سے مراد ہے قرآن کریم۔ جیسا کہ دوسری جگہ آیا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ﴾(البقرة:۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نازل ہوا تھا قرآن جو ہدایت ہے لوگوں کے لیے۔''

رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہدایت ہے:

﴿وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (الشوریٰ)

''اور یقیناً تو راہنمائی کرتا ہے لوگوں کی سیدھی راہ کی جانب۔''

گویا اَلْهُدٰی سے وحیٔ خداوندی مراد ہے خواہ جلی ہو یا خفی' اور دین حق سے مراد ہے زندگی کا سچا نظام' یعنی دین اسلام' اس لیے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین تو حق ہو نہیں سکتا:﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ''بے شک اللہ کے نزدیک تو الدّین (یعنی دین حق) صرف اسلام ہے''۔ دِیْنُ الْحَقِّ کے معنی اللہ کا دین بھی ہو سکتے ہیں' اس لیے کہ الحق اللہ کا نام ہے اور سورۃ النصر میں اسلام کو ''دِیْنُ اللّٰه'' کہا بھی گیا ہے: ﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ (اور دیکھ لیا ہے تم نے لوگوں کو کہ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں گروہ در گروہ) مگر اس سیاقِ کلام میں یہ معنی متبادر نہیں ہیں' اس لیے کہ هُوَالَّذِیْ میں جب اللہ کی ذات کا ذکر ہو گیا ہے تو اس کے بعد عربی مبین کے اسلوب کے مطابق ''ودینه'' ہونا چاہیے تھا' نام کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں پر موصوف کی اضافت ہے اپنی صفت کی جانب اور ترکیب اضافی ترکیب توصیفی کے معنوں میں ہے' یعنی دینِ حق.

اَلْهُدٰی کے بعد دین حق کا ذکر اِس حقیقت کے اظہار کے لیے کیا گیا ہے کہ قرآن وسنت میں صرف عقائد اور اخلاقی احکام کی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ زندگی کا پورا نظام بتایا گیا ہے۔ اس کے معنی کہیں یہ نہ سمجھ لیے جائیں کہ دین حق کوئی الگ چیز ہے۔ نہیں! دین حق الھُدی یعنی قرآن

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 6 (1,1)

وسنت کا دوسرا نام ہے۔

لِیُظْھِرَ میں لامِ تعلیل کا مفہوم یہ ہے کہ ہدایت اور دین حق کے ساتھ رسول بھیجنے کی علت وحکمت اور مقصد وہدف اظہارِ دین ہے۔ ''اظہار'' بابِ افعال سے مصدر ہے جس کا ماخذ ہے ظہور' یعنی کھل جانا اور واضح ہو جانا' اور اظہار کے معنی ہیں ظاہر کرنا اور واضح کرنا' لیکن جب اَظْھَرَ یُظْھِرُ کے بعد علٰی کا حرف آ جائے تو عربی اسلوب کلام میں اس کے دو معنی آتے ہیں: ایک اطلاع دینا اور کسی چیز پر مطلع کرنا' جیسے: ﴿فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا ۝۲۶ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ کے معنی ہیں ''پس مطلع نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر کسی کو' مگر اُس رسول کو جسے اس نے پسند کر لیا ہو اور چن لیا ہو (غیب پر مطلع کرنے کے لیے)''۔ اور دوسرے معنی آتے ہیں غالب کرنا' بلند کرنا اور اونچا کرنا۔ سیاقِ کلام کے ساتھ یہی معنی مناسب ہیں اور قدیم وجدید مفسرین نے بھی لِیُظْھِرَہٗ کی تفسیر کی ہے ''لِیُعْلِیَہٗ'' یعنی تاکہ اس دین کو غالب اور بلند کر دے۔

سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف کی مذکورہ آیات سے قبل اسلام کے دشمنوں کی ان پھونکوں کا ذکر ہوا ہے جن سے وہ اپنے خیال میں اسلام کے نور کو بجھانا چاہتے تھے' اور اللہ کے اس وعدے کا ذکر بھی ہوا ہے کہ اپنے دین کی روشنی کو پورا کرے گا' اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو اور وہ پھونکیں مارتے رہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ نے اپنا رسول اظہارِ دین کے لیے بھیجا ہے تو اس سیاق کلام کے ساتھ اظہار دین بمعنی اعلاء دین ہی مناسبت رکھتا ہے' اظہار دین بمعنی اطلاع دین اس سیاق میں مناسبت اور معنویت نہیں رکھتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کون غالب کرے گا اور کسے غالب کرے گا؟ قواعد عربیت کے اعتبار سے بھی اور سیاقِ کلام کے اعتبار سے بھی لِیُظْھِرَ کی ضمیر مرفوع مستتر رسول کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور معنی یہ بنتے ہیں کہ اللہ نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ رسول اس دین حق کو دوسرے ہر دین پر غالب کرے۔ اس پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ غالب کرنا اللہ کے اختیار میں ہے' رسول کے اختیار اور قدرت میں تو نہیں ہے' لیکن یہی سوال تو اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کے مفہوم پر اور ان سب آیات واحادیث کے مفہوم پر بھی کیا جا سکتا ہے جن میں افعال کی نسبت بندوں کی جانب کی گئی ہے یا جن میں بندوں کو کسی کام کا حکم دیا گیا ہے! ظاہر ہے کہ دین کو قائم کرنا اور قائم رکھنا تو اللہ کی قدرت میں ہے' تو انبیاء کو اور ان کی اُمتوں کو کیوں حکم دیا گیا ہے کہ دین کو قائم رکھو؟ لیکن مراد یہ ہے کہ دین کو قائم رکھنے کی کوشش کرو' اہتمام کرو اور عزم کرو۔

جب تم ارادہ کرو گے اور کوشش کرو گے تو اللہ تمہیں توفیق دے دے گا۔ اسی طرح دین کو غالب اور بلند کرنے سے مراد ہے غالب کرنے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ نے غلبۂ دین اور اعلاء دین کے لیے ہر ممکن جدوجہد بھی کی اور قتال بھی کیا اور اللہ کی توفیق سے انہوں نے اسلام کو پہلے مرحلے پر عرب میں اور پھر دوسرے مرحلے پر عجم پر بھی غالب کر دیا۔ بعد کے ادوار میں جب مسلمانوں میں خرابیاں پیدا ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان سے غلبۂ دین اور غلبۂ اہل دین کی نعمت واپس لے لی' لیکن اُمّت کا تا قیامت فرض وہی ہے جو اُن کے رسول کا تھا اور وہ یہ ہے کہ اظہارِ دین اور اعلائے دین کے لیے جہاد کرتے رہو۔

حقیقت یہ ہے کہ دین غالب کرنے سے مراد غلبۂ دین کے لیے جہاد کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ التوبہ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف میں ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کا ذکر آیا ہے اور تینوں کا اصل موضوع جہاد و قتال ہے۔ سورۃ التوبہ میں اس آیت سے قبل مشرکین عرب اور اہل کتاب دونوں کے خلاف جہاد کا ذکر ہے اور سورۃ الفتح میں زیر بحث آیت سے قبل صلح حدیبیہ کا ذکر ہوا ہے جسے قرآن نے فتح مبین کہا ہے اور اس کے بعد مسجد حرام میں داخل ہونے اور فتح کی بشارت دی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ الصّف میں بھی زیر بحث آیت کے بعد جہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے اور فتح قریب کی بشارت دی گئی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تینوں مقامات پر آیۂ زیر بحث کے سیاق وسباق سے ثابت ہوتا ہے کہ ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کا مطلب ہے ''تاکہ وہ رسول دین حق کو غالب کرنے کے لیے جہاد کرے''۔ جہاد و قتال کے معنی ہی یہ ہیں کہ اعلاء کلمۃ الحق اور اظہارِ دین کے لیے جدوجہد کی جائے اور جنگ لڑی جائے۔ لفظ لِيُظْهِرَ کی ضمیر مرفوع کا مرجع رسولہ کو قرار دینے کی ایک وجۂ ترجیح یہ بھی ہے کہ یہ لفظ ضمیر کے زیادہ قریب ہے۔

مولانا مودودیؒ نے آیت کی یہی تشریح کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''بعثت رسول ﷺ کی غرض اس آیت میں بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دین حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوئی کہ جو نظامِ زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب بن کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائش میں سمٹ کر رہے' بلکہ وہ بادشاہِ ارض وسما کا نمائندہ

---

(۱) تفہیم القرآن' سورۃ التوبۃ' حاشیہ ۲۲۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\msll-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 7 (1,1)

بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔‘‘(۱)

لیکن اکثر قدیم و جدید مفسرین نے آیت کی جو تفسیر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک لِیُظۡھِرَہٗ کی ضمیر مرفوع کا مرجع اللہ ہے اور ضمیر منصوب کا مرجع دین حق ہے‘ اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے اپنا رسول ﷺ ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ یعنی اللہ اپنے دین کو دوسرے ہر دین پر غالب کر دے۔ لیکن اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تکوینی اور غیبی قوت سے اس دین کو غالب کرے گا۔ اگر مطلب یہ ہوتا تو پھر رسول کا ذکر آیت میں نہ کیا جاتا‘ بلکہ یوں کہا جاتا کہ اللہ نے دین حق نازل کیا ہے تاکہ وہ اسے غالب کر دے۔ لیکن آیت میں غلبۂ دین کا ذکر ارسالِ رسول کی حکمت اور علت کے طور پر کیا گیا ہے‘ جس کے معنی یہی ہیں کہ اللہ اپنے دین کو اپنے رسول کے جہاد کے نتیجے میں غالب کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیات کے سیاق و سباق میں جہاد و قتال کا ذکر ہوا ہے۔ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور اللہ تعالیٰ جو کام بھی کرتا ہے انہی اسباب کے پردے میں کرتا ہے۔ اسباب میں وہی تأثیر ڈالتا ہے اور انہیں نتیجہ خیز بنا دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ معجزے اور کرامت کے طور پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ اسباب اور قانونِ فطرت (نیچر) سے بالا بالا اپنی تکوینی طاقت کے ذریعے بھی کام کرتا ہے اور کرتا رہا ہے‘ اس لیے کہ وہ تو اسباب اور نیچر کا محتاج نہیں ہے‘ بلکہ اسباب اور نیچر اس کے پیدا کردہ ہیں اور اسی کے محتاج ہیں‘ لیکن اللہ کی عام سنت یہی ہے کہ وہ اسباب پر ان کے فطری نتائج مرتب کرتا ہے اور کام ہو جاتا ہے۔ قرآن و سنت میں ایسے کاموں کی نسبت اللہ کی جانب بھی کی گئی ہے‘ اس لیے کہ اِن کاموں کا فاعلِ حقیقی وہی ہے اور بندوں کی جانب بھی کی گئی ہے‘ اس لیے کہ یہ کام اللہ نے بندوں کی کوششوں کے نتیجے میں کیے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس تفسیر و تاویل اور پہلی تاویل و توجیہہ دونوں کے اعتبار سے آیت میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان ہوا ہے کہ وہ دین حق کو اپنی جدوجہد کے ذریعے غالب کر دیں یا اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی جدوجہد میں اثر ڈال کر دین حق کو غالب کر دے گا۔ دونوں صورتوں میں یہ آیت غلبۂ دین کے لیے جدوجہد کا ماخذ ہے۔ اگرچہ غلبۂ دین کے لیے جدوجہد کا ماخذ وہ تمام آیات و احادیث بھی ہیں جن میں جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر ہوا ہے لیکن یہ آیت بھی ایک ماخذ ہے جس میں غلبۂ دین کو بعثتِ رسولؐ کی علت اور مقصد قرار دیا گیا ہے۔ لیکن وہی سکالر جو اقامت دین کو فریضہ نہیں سمجھتے‘ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''آیت کے معنی ہم اس طرح بیان کریں گے:''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ یعنی اللہ اس دین کو سرزمین عرب کے تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ یہ بات ان مشرکین کو کتنی ہی ناگوار ہو''۔ قواعد عربیت اور نظائر قرآن کی روشنی میں آیت کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے اور اس ترجمے سے واضح ہے کہ غلبۂ دین کے لیے اب کسی شخص کی جدوجہد کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا حکم لاریب نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ ہی کے ساتھ خاص ہے۔ حضور ﷺ کے بعد اب قیامت تک کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس آیت کے حکم اور اس کے مقتضیات ولوازم کا کوئی تعلق اپنی ذات یا اپنی جدوجہد کے ساتھ قائم کرے۔''(۱)

ہمارے اس ''ماہر عربیت'' دوست کی جو تحریریں میری نظر سے گزری ہیں ان سے میں نے ان کی عادت اخذ کی ہے کہ یہ حضرت اپنے فہم سے ایک بات خوبصورت الفاظ میں کہہ دیتے ہیں اور پھر اپنی حتمی رائے سنا دیتے ہیں کہ قواعد عربیت کے لحاظ سے یہی بات صحیح ہے۔ یہاں پر بھی انہوں نے فرمایا ہے:

''عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ چونکہ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ کا معطوف علیہ ہے اور الْمُشْرِكُوْنَ کی تعبیر قرآن مجید میں ہمیشہ مشرکین بنی اسماعیل ہی کے لیے اختیار کی جاتی ہے اس وجہ سے الدین کا الف لام عربیت کی رو سے لازماً عہد کے لیے ہے۔ چنانچہ تمام ادیان سے یہاں سرزمین عرب کے تمام ادیان مراد ہیں''۔ (ایضاً)

سردست تو میں ان کے اس ادّعا کو نظر انداز کرتا ہوں کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ قرآن میں الْمُشْرِكُوْنَ کا لفظ بنی اسماعیل ہی کے مشرکین کے لیے اختیار کیا جاتا ہے' اور درج ذیل امور پر توجہ سے غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

اظہارِ دین واعلاءِ دین کو آیت میں ارسالِ رسول کی علت قرار دیا گیا ہے' یعنی اللہ نے اپنا رسول بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ دین حق کو غالب کرے۔ تو کیا اس نے اپنا یہ رسول صرف سرزمین عرب کے لیے بھیجا تھا یا پوری دنیا کے لیے بھیجا تھا؟ اس آیت میں تو اس بات کی تصریح کیا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے کہ دین حق صرف ادیانِ عرب پر غالب ہونے کے لیے آیا ہے' دنیا کے تمام ادیان پر غلبہ پانا اس دین کا اصل مقصد نہیں ہے۔ اس آیت کے سیاق وسباق اور قرآن کے نظائر سے تو صاف نظر آ رہا ہے کہ الدّین کلّہ میں الف لام جنس کے لیے ہے یا استغراق کے لیے ہے اور مراد دنیا کے سارے ادیانِ باطلہ ہیں' صرف عرب

(۱) برھان' ص ۱۲'۳۱۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 8 (1,1)

کے ادیان مراد نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کشمکش کا آغاز سرزمین عرب پر ہوا تھا اور اسلام کو پہلے مرحلے پر غلبہ بھی سرزمین عرب میں حاصل ہوا تھا۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ''وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ'' میں بنو اسماعیل ہی کے مشرکین مراد ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو دین حق کا غلبہ کیوں ناگوار تھا؟ جواب یہی ہوسکتا ہے کہ اس دین کا بنیادی عقیدہ توحید ہے جو مشرکین پر سخت ناگوار گزرتا ہے خواہ عرب کے مشرکین ہوں یا عجم کے۔ مشرک جہاں بھی ہو توحید کا غلبہ اسے سخت ناگوار ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الشوریٰ میں اقامتِ دین کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ: ﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ط﴾ یعنی ''بڑا ناگوار ہے مشرکین پر وہ دین جس کی طرف تو اُن کو بلاتا ہے''۔ بہرحال لفظ اَلْمُشْرِكُوْنَ کو اس دعوے کا قرینہ اور دلیل قرار دینا کہ الدّین کلّہ سے عرب ہی کے ادیان مراد ہیں، محض تکلف اور تصنع ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ سرزمین عرب میں دین حق کو غلبہ کیا جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا یا اللہ نے اپنی تکوینی قوت سے غالب کیا تھا اور رسول واصحابِ رسول کی جدوجہد کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا؟ اگر اللہ نے جدوجہد کے نتیجے میں دین کو غلبہ دیا تھا تو پھر کیا رسول ﷺ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی جدوجہد اُمّت مسلمہ کے لیے اُسوۂ حسنہ نہیں ہے؟ اگر ہے، اور یقیناً ہے، تو پھر آپ کی اس بات کی کیا توجیہہ ہے کہ یہ حکم نبیؐ اور صحابہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اب قیامت تک کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس آیت کے حکم کا کوئی تعلق اپنی جدوجہد کے ساتھ قائم کرے؟ ؏ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

جو بات صحیح ہے وہ صرف اتنی ہے کہ رسولؐ اور اس کے رفقاء کی جدوجہد کے نتیجے میں اللہ نے عرب میں اسلام غالب کیا تھا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پاکستان میں بھی کسی جدوجہد کے نتیجے میں اسلام ضرور غالب ہوگا۔ جدوجہد فرض ہے اور اس کا ماخذ یہ آیت بھی ہے۔

(۳) اُمّت مسلمہ کی نمائندہ حکومت کا مقصد بھی اقامت دین ہے

اُمّت مسلمہ کے وجود کا مقصد تو متعین ہوگیا کہ شہادت حق، بھلائی کا پھیلانا، برائی کا مٹانا، اظہارِ دین و اعلاءِ دین کے لیے جدوجہد کرنا اور اقامتِ دین کا فریضۂ جامعہ ادا کرنا اِس عالمی اسلامی جماعت کا فرضِ منصبی اور مقصدِ وجود ہے، اس لیے کہ اس کے قائد محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت یہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اُمّت کی منتخب کردہ اور اس

کی نمائندگی کرنے والی حکومت کی تشکیل کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا مقصد صرف امن و امان قائم کرنا‘ ریاست کے شہریوں کو متحد رکھنا‘ ان کو سہولتیں بہم پہنچانا‘ ان کی زندگی کے معیار کو بلند کرنا اور ملک کا دفاع کرنا ہے یا اُس کا اصل فریضہ کچھ اور ہے جو اُس کو دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے‘ اس لیے کہ اسلامی حکومت اُمّت مسلمہ کی وکالت اور نمائندگی کرتی ہے تو جو مقصد اُمّت کا ہے وہی مقصد اسلامی حکومت کا بھی ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں اقامتِ دین کا جو حکم انبیاء اور اُمّت مسلمہ کو دیا گیا ہے انبیاء علیہم السلام کی خلافت اور اُمّت مسلمہ کی وکالت کرنے والی اسلامی حکومت کا مقصد وجود بھی یہی اقامت دین ہے جو ایک فریضۂ جامعہ ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۰ میں اس بہترین اُمّت کے برپا کرنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ معروف کا حکم دے گی اور منکر سے روکے گی۔ اسلامی حکومت کا بھی یہی فرضِ منصبی ہے جو اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱﴾ (الحج)

’’یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر قوت و اقتدار دے دیں ہم اُن کو زمین میں تو وہ نماز قائم کریں گے‘ زکوٰۃ دیں گے‘ بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے‘ اور اللہ ہی کے لیے ہے انجام تمام کاموں کا۔‘‘

اس آیت سے متصلاً قبل دو آیتوں ۳۹ اور ۴۰ میں قتال کی اجازت دی گئی ہے جو دَورِ مکی میں نہیں تھی‘ اور قتال کا یہ مقصد بتایا گیا ہے کہ ظلم و فساد کا مٹانا اور عدل و صلاح کا نظام قائم کرنا قتال فی سبیل اللہ کا اصل مقصد ہے۔ اور اس کے بعد درج بالا آیت نمبر ۴۱ میں قتال کے نتیجے میں جو حکومت بنے گی اس کے منشور کا چار نکاتی پروگرام بیان کیا گیا ہے‘ یعنی اقامتِ صلوٰۃ‘ ایتاءِ زکوٰۃ‘ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

ان تین آیات کو ملا کر پڑھنے سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جہاد و قتال کا مقصد لوگوں کو جبر و اکراہ کے ذریعے مسلمان بنانا نہیں ہے‘ بلکہ ظلم و فساد کے نظام کو مٹانا اور عدل و انصاف کا نظام قائم کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ اسلامی حکومت جہاد و قتال کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ اور تیسری بات یہ واضح ہوگئی کہ اسلامی حکومت کا مقصدِ وجود اقامتِ دین ہے‘ اس لیے کہ درج بالا آیت میں جو فرائض اربعہ بیان ہوئے ہیں وہ اقامت دین کے

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2016 4:44 PM PAGE 9 (1,1)

فریضۂ جامعہ میں شامل ہیں اور اس کلیۂ واحدہ کی جزئیات ہیں۔

اسلامی حکومت کا یہی مقصد رسول اللہ ﷺ نے بھی وضاحت وصراحت کے ساتھ متعین کر دیا ہے:

((اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قُرَیْشٍ لَا یُعَادِیْھِمْ اَحَدٌ اِلَّا کَبَّہُ اللّٰہُ فِی النَّارِ عَلٰی وَجْھِہٖ مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ))(۱)

''یہ اقتدار قریش میں رہے گا' جو بھی اس بارے میں ان سے دشمنی کرے گا تو اس کو اللہ اوندھے مُنہ آگ میں ڈال دے گا' جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں گے۔''

قریش کو چونکہ جاہلیت میں بھی اور اسلام میں بھی لوگوں کا زیادہ اعتماد حاصل تھا اور حکومت مسلمانوں کی اسی جماعت کو دی جا سکتی ہے جس کو اکثریت کا اعتماد حاصل ہو' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ امامت وقیادت قریش میں رہے گی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ دین کو قائم رکھیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عامۃ الناس کی معتمد ومنتخب حکومت بھی اگر اقامت دین کا فرض ادا نہ کرے تو شرعاً وہ حکومت بالحق نہیں ہوگی اور اس کو برسر اقتدار رہنے کا کوئی دینی استحقاق حاصل نہیں ہوگا۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ'' کی تشریح اس طرح کی ہے: ای مدۃ اقامتھم امور الدین (یعنی ان کو حکومت کرنے کا حق اُسی وقت تک حاصل رہے گا جب تک کہ وہ دینی امور کو قائم رکھیں گے۔)

مسند احمد میں انس بن مالکؓ اور ابو برزہ اسلمیؓ سے مروی ہے کہ ہم ایک انصاری کے گھر میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا:

((اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ اِنَّ لَھُمْ عَلَیْکُمْ مَا اِنِ اسْتُرْحِمُوْا فَرَحِمُوْا وَاِنْ عَاھَدُوْا اَوْفُوْا وَاِنْ حَکَمُوْا عَدَلُوْا فَمَنْ لَمْ یَفْعَلْ ذٰلِکَ مِنْھُمْ فَعَلَیْہِ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))(۲)

''امراء قریش میں سے ہوں گے۔ ان کا تم پر اطاعت کا حق ہے بشرطیکہ جب اُن سے رحم طلب کیا جائے تو وہ رحم کریں' جب وہ وعدہ کریں تو اسے پورا کریں اور جب وہ فیصلہ کریں تو عدل وانصاف سے کریں۔ اور ان میں سے جو ایسا نہیں کرے گا تو اس پر اللہ' اس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہو گی۔''

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب و کتاب الاحکام۔

(۲) الفتح الربانی' ص ۶'۷' ج ۲۳۔

ظاہر بات ہے کہ لعنتی امیر اللہ کے عذاب کے طور پر بالفعل امیر تو ہوسکتا ہے مگر بالحق امیر نہیں ہوسکتا کہ اسے الجماعۃ کہا جاسکے اور اس کی اطاعت و وفاداری کو التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم قرار دیا جاسکے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِسْتَقِیْمُوْا الْقُرَیْش مَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاِذَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَضَعُوْا سُیُوْفَکُمْ عَلٰی عَوَاتِقَکُمْ فَاَبِیْدُوْا خَضْرَاءَ ھُمْ فَاِذَا لَمْ تَفْعَلُوْا فَکُوْنُوْا زَارِ عِیْنَ اَشْقِیَاءَ تَاْکُلُوْا مِنْ کَدِّ اَیْدِیْکُمْ))(۱)

''تم قریش کی اطاعت پر قائم رہو جب تک کہ وہ تمہارے لیے حق پر قائم رہیں۔ جب وہ ایسا نہ کریں تو پھر تم اپنی تلواریں کاندھوں پر رکھو اور اُن کے سر برآوردہ لیڈروں کو ہلاک کردو' اور جب تم ایسا نہ کرسکو تو بدنصیب کاشتکار بن جاؤ اور اپنے ہاتھوں کی محنت سے کما کر کھاؤ''۔

یعنی اگر تم اس نااہل حکومت کا تختہ الٹنے کی طاقت نہ رکھتے ہو یا باوجود طاقت کے یہ کام کرنا نہ چاہتے ہو تو پھر ذلت اور بدنصیبی کی زندگی گزارو اور اپنے دن پورے کرو۔ حافظ نورالدین ہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں۔(۲)

البتہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں انقطاع ہے' اس لیے کہ سالم بن ابی الجعد کا سماع ثوبانؓ سے ثابت نہیں ہے' لیکن اسی مضمون کی حدیث طبرانی نے نعمان بن بشیرؓ سے بھی نقل کی ہے۔(۳)

یہ حدیث مسند احمد میں بھی نقل ہوئی ہے لیکن تلواریں اٹھانے والا حصہ اس میں موجود نہیں۔(۴)

حافظ ابن حجر نے ابن اسحاق (متوفی ۱۵۰ھ) سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنو ساعدہ کی مجلس میں فرمایا تھا:

---

(۱) المعجم الصغیر للطبرانی بتحقیق محمد شکور' ص ۱۳۴' ج ۱۔

(۲) مجمع الزوائد' ص ۱۹۵' ج ۵۔

(۳) فتح الباری' کتاب الاحکام' ص ۲۳۴' ج ۱۶۔

(۴) الفتح الربانی' ص ۲۷۶' ج ۲۳۔

(۵) فتح الباری' ص ۳۳۲' ج ۱۶۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ma11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 10 (1,1)

اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قُرَیْشٍ مَا اَطَاعُوا اللّٰہَ وَاسْتَقَامُوْا عَلٰی اَمْرِہٖ(۵)

’’حکومت قریش میں رہے گی جب تک کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں اور اس کے دین پر قائم رہیں۔‘‘

مذکورہ دلائل سے یہ بات بغیر کسی ابہام واشتباہ کے واضح ہوگئی کہ اُمّت مسلمہ کی نمائندہ حکومت کا مقصد وہی ہے جو اُمّت کا مقصد وجود ہے اور جو محمد رسول اللہﷺ کا مقصد بعثت ہے‘ اور وہ ہے اقامت دین۔ چونکہ اسلامی حکومت یہی فرض انجام دیتی ہے‘ اس لیے اس کا اصطلاحی نام خلافت ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے خلافت کی تعریف اور اس کے فرائضِ منصبی اس طرح بیان کیے ہیں:

> ھی الریاسة العامة فی التصدی لاقامة الدین باحیاء العلوم الدینیة واقامة ارکان الاسلام و القیام بالجھاد وما یتعلق به من ترتیب الجیوش والفرض للمقاتلة واعطاء ھم من الفیئ والقیام بالقضاء واقامة الحدود ورفع المظالم والامر بالمعروف والنھی عن المنکر نیابة عن النبیﷺ(۱)
>
> ’’خلافت وہ عمومی ریاست ہے جو اقامت دین کے لیے عملاً متوجہ رہتی ہو‘ (اور دین کو قائم رکھنے کے لیے) دینی علوم کی اشاعت اور احیاء کا فرض انجام دیتی ہو‘ ارکانِ اسلام (نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج) کو قائم رکھتی ہو‘ جہاد اور اس سے متعلقہ امور کے لیے کمر بستہ اور تیار رہتی ہو‘ مثلاً فوجوں کو منظّم رکھنا‘ ان کو تنخواہیں دینا اور مالِ فئے میں ان کی اعانت کرنا‘ عدالتی نظام قائم رکھتی ہو‘ شرعی سزائیں قائم کرتی ہو‘ مظالم کا خاتمہ کرتی ہو‘ نیکی کا حکم دیتی ہو اور برائی سے روکتی ہو اور یہ سارے فرائضِ ریاست وہ نبیﷺ کی نیابت کے طور پر انجام دیتی ہو۔‘‘

شاہ صاحبؒ نے جو آٹھ فرائض بیان کیے ہیں یہ بھی کلیات ہیں جن کے تحت بہت سی جزئیات ہیں‘ لیکن اِن کلیاتِ ثمانیہ اور دوسرے فرائض پر مشتمل کلیہٗ واحدہ اور فریضۂ جامعہ اقامت دین ہے۔ شاہ صاحب آگے فرماتے ہیں کہ مذکورہ سارے فرائض اصل میں فرائض نبوت ہیں جو رسول اللہﷺ نے بڑے احسن اور اکمل طریقے سے انجام دیے تھے‘ لیکن آپﷺ کے

---

(۱) ازالۃ الخفاء‘ ص ۲۔

انتقال کے بعد بھی اقامت دین مذکورہ تفصیل کے ساتھ واجب ہے اور اقامت دین موقوف ہے ایسے شخص کے تقرر پر جو اِس کام کا اہتمام و انتظام کرے۔ بس یہی شخص خلیفہ اور امیر ہوتا ہے۔ [1]

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) نے بھی فرمایا ہے کہ اسلامی حکومت کے بغیر دین کو قائم اور برقرار نہیں رکھا جا سکتا: بل لا قیام لِلدّین اِلّا بھا. [2]

سورۃ النور کی آیت نمبر ۵۵ جس کو آیتِ خلافت کہا جاتا ہے' اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خلافت یعنی اسلامی حکومت اللہ کی نعمت ہے جس کے ذریعے دینِ اسلام کو تمکن اور مضبوطی حاصل ہوتی ہے' امن و امان قائم ہوتا ہے اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کے حملوں کا خوف و خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس خلافت کے نظام میں لوگ اللہ ہی کی بندگی کرتے ہیں اور مشرکانہ نظام ختم ہو جاتا ہے۔ یہی خلافت اور اسلامی حکومت الجماعۃ ہے جو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کی اطاعت و وفاداری اور جس کا التزام دین کا حکم ہے' جس سے الگ ہونا جاہلیت ہے اور اسلام کا قلادہ گردن سے اتارنا ہے۔

(جاری ہے)

---

(۱) ازالۃ الخفاء' ص ۳۔

(۲) السیاسۃ الشرعیۃ' ص ۱۷۲' ۱۷۳۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2016 4:44 PM PAGE 11 (1,1)

تفہیم المسائل

التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم

تحریر: مولانا گوہر رحمٰنؒ

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۴) الجماعۃ سے مراد وہ حکومت ہے جو اقامت دین کا فرض انجام دیتی ہو

مذکورہ عنوانات کے تحت جو بحث کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُمّت مسلمہ کا مقصدِ وجود بھی اقامت دین ہے اور اس اُمّت کی معتمد و منتخب حکومت کا مقصد وجود بھی اقامت دین ہے۔ اس بحث سے یہ بات بھی از خود ایک منطقی نتیجے کے طور پر سامنے آ گئی ہے کہ الجماعۃ سے مراد مطلقاً کوئی حکومت نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد وہ حکومت ہے جو اقامت دین کا فرض انجام دیتی ہو۔ اور التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے' لیکن اگر اسلامی حکومت موجود ہی نہ ہو تو پھر اس کے لیے منظّم اور اجتماعی جدوجہد کرنا ایک دینی فریضہ ہے۔ اور جو جماعتیں اسلامی حکومت برائے اقامت دین کے لیے دین و شریعت اور سنّتِ رسولؐ و سنتِ اصحابِ رسولؐ کے اصول و ہدایت کے مطابق کام کر رہی ہوں ان میں سے جس پر زیادہ اعتماد ہو اس میں شمولیت اختیار کرنا اور اس کے نظم کا التزام کرنا جدوجہد برائے غلبۂ دین و اقامتِ دین کا لازمی تقاضا ہے۔

بعض سکالر جو یہ کہتے ہیں کہ کفر بواح کی مرتکب حکومت بھی اُس وقت تک الجماعۃ ہوتی ہے جب تک کہ اسے عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہو اور مسلمان رعایا اُس پر مجتمع ہو' اور اس کے قوانین کی اطاعت و وفاداری التزام جماعت ہے' اگرچہ وہ عملاً قرآن و سنّت کی بالادستی سے منحرف ہو چکی ہو اور ملک کا نظام سیکولرازم کے اصولوں کے مطابق چلا رہی ہو' ان سکالروں سے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کریں۔ ''الجماعۃ'' کا اطلاق آخر اس حکومت پر کیسے ہو سکتا ہے جو قرآن و سنّت کی بالادستی کو عملاً تسلیم نہ کرتی ہو' فیصلے مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کے خلاف کرتی ہو' بھلائی کے کاموں کے راستے میں روڑے اٹکا رہی ہو

اور برائی کو فروغ دے رہی ہو‘ حدود اللہ اور شعائر اللہ کا مذاق اڑا رہی ہو اور اسلام کی دشمن طاغوتی قوتوں کی آلۂ کار بنی ہوئی ہو؟ میری رائے تو یہ ہے کہ ایسی حکومت کو الجماعۃ کہنا اس دینی اور شرعی اصطلاح کی توہین ہے‘ ایک سیکولر حکومت کو دینی جواز فراہم کرنا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اس کو مسلمانوں نے منتخب کیا ہے تو مسلمانوں نے اگر دھوکے اور فریب میں آ کر یا مفاد پرستی اور خودغرضی کی وجہ سے یا اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایسے لوگوں کو منتخب کر لیا ہو جو اقامت دین کا فریضہ انجام دینے کی بجائے طاغوتی اور غیر اسلامی نظام چلا رہے ہوں تو صرف اکثریت کا ووٹ حاصل کرنے سے تو الطاغوت کو الجماعۃ نہیں کہا جا سکتا۔ اسلام کے سیاسی نظام میں اسلامی حکومت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی معتمد ہو اور مسلمانوں کی رائے سے بنی ہو‘ اور یہ بھی لازمی شرط ہے کہ وہ اسلام کے معیارِ اہلیت کی کم از کم شرائط پر پوری اترتی ہو اور ریاست کا نظام قرآن وسنّت کے مطابق چلاتی ہو۔ اصل معیاری صورت تو یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ بھی علم وعمل کے اعتبار سے اپنے دَور میں ایک ممتاز مسلمان ہو۔ لیکن اگر شخصی کردار وعمل کے لحاظ سے اس کے اندر کچھ خرابیاں اور کمزوریاں موجود ہوں مگر جب تک ریاست کا نظام شریعت کے مطابق چلا رہا ہو تو شخصی خرابیوں کے باوجود اُس کی حکومت اسلامی حکومت ہوگی اور اس کی اطاعت فی المعروف شرعاً ضروری ہوگی‘ البتہ حکمران کی شخصی خرابیوں کے ازالے اور اصلاح کے لیے نقد و احتساب اور نصیحت کا فرض ادا کرنا بھی ضروری ہوگا۔

سمع و طاعت اور التزام جماعت کے بارے میں قرآن وسنّت کی نصوص کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے‘ سیکولر حکومت کے ساتھ اِن نصوص کا کوئی تعلق نہیں ہے‘ خواہ جمہوری ہو یا آمرانہ۔

عَنْ اُمِّ الْحُصَیْنِ اَنَّھَا سَمِعَتُ النَّبِیَّ ﷺ یَخْطُبُ فِیْ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ وَھُوَ یَقُوْلُ: ((وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا)) (۱) وَفِیْ رِوَایَۃٍ : ((مَا اَقَامَ فِیْکُمْ کِتَابَ اللّٰہِ)) (۲)

’’اُمّ الحصینؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ حجۃ الوداع کے دوران اپنے خطاب میں فرما رہے تھے: ’’اگر تم پر ایک غلام بھی امیر بنا دیا گیا ہو

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الامارات۔

(۲) الفتح الربانی‘ ص ٤٤‘ ج ٢٣۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 12 (1,1)

جو تمہاری قیادت اور امارت اللہ کی کتاب کے مطابق کر رہا ہو تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو"۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ: "جب تک کہ تمہارے درمیان اللہ کی کتاب قائم رکھتا ہو"۔

التزامِ جماعت اور سمع و طاعت کے بارے میں یہ رسول اللہ ﷺ کی آخری ہدایت ہے جو آپؐ نے اپنی اُمّت کو دی ہے۔ اس ہدایت میں دو باتوں کی تاکید کی گئی ہے' ایک یہ کہ اجتماعی نظام قائم رکھو' اگر امیر تم کو طبعاً پسند نہ بھی ہو' مثلاً وہ غلام ہو پھر بھی اس کی اطاعت کرو' تاکہ مسلمانوں کی جماعت میں انتشار پیدا نہ ہو اور اُمّت کی وحدت برقرار رہے' اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ حکومت کا نظام قرآن کے مطابق چلا رہا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حکومت قرآن و سنّت کی بالادستی تسلیم نہیں کرتی اور ملک کا نظام لادین سیاست کے اصولوں کے مطابق چلا رہی ہے تو درج بالا حدیث کا اور اس مضمون کی دوسری احادیث کا ایسی حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! اگر ہم پر ایسے حکمران مسلط ہو گئے جو نہ آپؐ کی سنّت کی پیروی کرتے ہوں اور نہ آپؐ کے حکم پر عمل کرتے ہوں تو ایسے حکمرانوں کے بارے میں آپؐ کا حکم کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا طَاعَةَ لِمَنْ لَمْ يُطِعِ اللّٰهَ)) (۱)

"جو اللہ کی اطاعت نہیں کرتا اس کی کوئی اطاعت نہیں (تم بھی اس کی اطاعت نہ کرو)۔"

بخاری و مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی"۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ:

فان کل من یامر بحق و کان عادلا فھو امیر الشارع لانه تولی بامره وبشریعته(۲)

"جو امیر حق کے مطابق حکم دیتا ہے اور وہ عادل بھی ہے تو وہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقرر کردہ امیر کی طرح ہے' اس لیے کہ وہ شارع کے حکم اور ان کی شریعت کے مطابق امیر بنا ہے۔"

---

(۱) فتح الباری' کتاب الاحکام' ص ۲۲۸' ج ۱۶۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الفتن۔

یعنی جب حکمران نبی ﷺ کی نیابت میں کام کرتا ہے تو اس کی اطاعت منوب عنہ کی اطاعت ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی''۔ لیکن جب حکمران قرآن وسنّت کی بالا دستی تسلیم نہیں کرتا اور شریعت محمدیؐ سے آزاد ہو کر حکومت کر رہا ہے تو اس کی اطاعت آخر کس بنیاد پر نبی کریم ﷺ کی اطاعت سمجھی جائے گی؟

یہ درست ہے کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ امیر تمہیں پسند ہو یا نا پسند' اس کا حکم تمہاری رائے یا طبیعت ومزاج کے مطابق ہو یا نہ ہو' وہ اگر تم پر دوسروں کو ترجیح دے رہا ہو یا تمہارے حقوق ادا نہ کر رہا ہو' جیسی بھی صورت حال ہو تم اس کی اطاعت کرو اور مسلمانوں کی اجتماعت کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ لیکن ایک تو ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلح بغاوت نہ کرو' بلکہ دوسرے ذرائع سے ایسے امیر کی اصلاح یا پھر اس کو بدلنے کے لیے کوشش کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ احادیث اس حکومت کے بارے میں ہیں جو ملک کا نظام شریعت کے مطابق چلا رہی ہو اور اس کی ریاست میں قرآن وسنّت کی بالا دستی عملاً تسلیم کی جاتی ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس مضمون کی احادیث کا تعلق ذاتی اور شخصی حقوق سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر حکمران تم پر ذاتی طور پر ظلم بھی کر رہا ہو مگر جب ملک میں شریعت نافذ ہے تو تم صبر کرو اور اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ آخر اِن احادیث کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت سے باغی اور منحرف سیکولر حکومت بھی الجماعۃ ہے اور اس جماعت کا التزام تقاضائے شریعت ہے؟

یہ ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ ایک ہی موضوع سے تعلق رکھنے والی احادیث ایک دوسری کی تشریح کرتی ہیں۔ اس قاعدے کی رو سے وہ تمام احادیث جن میں اطاعت امیر کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ وہ اقامت دین کا کام کر رہا ہو اور شریعت کی بالا دستی کو عملاً تسلیم کرتا ہو' ان تمام احادیث کی تشریح کرتی ہیں جن میں یہ قید موجود نہیں ہے۔ مثلاً ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آیا کہ:

> ''جو شخص سلطان کی اطاعت سے بالشت برابر بھی باہر نکلا ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔'' (۱)

اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الفتن۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 13 (1,1)

''جو شخص الجماعۃ سے بالشت برابر بھی الگ ہوا تو اس کی موت جاہلیت پر ہوگی۔''(۱)

تو دوسری آیات واحادیث کی روشنی میں جب ہم غور کرتے ہیں تو ان دونوں حدیثوں کا مفہوم ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت سے باہر نکلنا اور اسلامی حکومت پر مجتمع ہونے والے مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہونا جاہلیت ہے' اور وہ بھی اس صورت میں جب اس کے خلاف مسلح بغاوت کی جائے۔ جیسا کہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ''خروج من السلطان'' کنایہ ہے جنگ کرنے سے: وھی کنایۃ عن معصیۃ السلطان و محاربتہ (۲)

لیکن اگر دوسری احادیث سے صرف نظر کر کے ان دو احادیث پر غور کیا جائے تو سلطان سے مطلق حکومت مراد لے لی جائے گی خواہ وہ کفر بواح کی مرتکب ہو' یا فسق کی مرتکب ہو یا وہ عادل حکومت ہو۔

(۵) قرآن وسنّت کے التزام سے منحرف حکومت الجماعۃ نہیں' بلکہ طاغوت ہے

جو حکومت قرآن وسنّت سے منحرف ہو اور اس کی مقنّنہ' عدلیہ اور انتظامیہ تینوں شریعت کی برتری اور بالادستی کا التزام نہ کرتے ہوں تو ایسی حکومت کو طاغوت کہا جاتا ہے جس کے بارے میں حکم خداوندی ہے کہ: ﴿وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ﴾ (النحل:۳۶) ''طاغوت سے الگ ہو جاؤ''۔ تو وہ الجماعۃ کیسے ہو سکتی ہے جس کے بارے میں حکم رسولؐ یہ ہے کہ: ((عَلَیۡکُمۡ بِالۡجَمَاعَۃِ)) ''جماعت کا التزام کرو''۔ آخر ایک ہی حکومت سے اجتناب اور اس کا التزام دونوں کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ اللہ نے جب طاغوت سے اجتناب کرنے والوں کو خوشخبری سنائی ہے (الزمر:۱۷) تو اس کا رسول طاغوت کے التزام کا حکم کیسے دے سکتا ہے؟ جب کلام اللہ میں طاغوت کی اطاعت کرنے والوں کو لعنتی' شیطان کے ساتھی اور بدترین لوگ قرار دیا گیا ہے (النساء:۵۱'۵۲'۷۶ اور المائدۃ:۶۰) تو کلام الرسول میں یہ حکم کیسے دیا جا سکتا ہے کہ اس کا التزام کرو اور اسی کے ساتھ چمٹے رہو! طاغوت کے پاس اپنے تنازعات اور معاملات فیصلہ کرانے کے لیے لے جانا تو منافقت اور ضلالت ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے:

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَیُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۶۰﴾﴾ (النساء)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الفتن۔ (۲) فتح الباری' ص ۱۱۲' ج ۱۲۔

''کیا تو نے دیکھا نہیں ہے ان لوگوں کو جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو اتاری گئی ہے تیرے پاس اور ان کتابوں پر بھی جو اتاری گئی تھیں تجھ سے پہلے' مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے تنازعات فیصلہ کرانے کے لیے لے جائیں طاغوت کے پاس' حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کی اطاعت سے انکار کریں' اور شیطان تو چاہتا ہے کہ ان کو بھٹکا کر حق سے دُور لے جائے''۔

اس آیت میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کو چھوڑ کر طاغوت کے پاس اپنے تنازعات اور معاملات لے جانا منافقت ہے اور ضلال بعید ہے۔ تو آخر کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا رسول طاغوت کو الجماعۃ کے مفہوم میں شامل کر لے' اس کے التزام کا حکم دے اور اس سے الگ ہونے کو جاہلیت اور اسلام کا قلادہ گردن سے اتارنا قرار دے! ایسا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

طاغوت کا صحیح مفہوم

جس طرح التزامِ جماعت کا صحیح مفہوم جاننا ضروری ہے اسی طرح طاغوت کا صحیح مفہوم معلوم کرنا بھی ضروری ہے' تاکہ التزامِ جماعت التزام طاغوت کی شکل اختیار نہ کر سکے۔ طاغوت بروزن فعلوت کے معنی ہیں کثیر الطغیان' یعنی سرکشی اور نافرمانی میں حد سے بڑھ جانے والا۔ ائمۂ لغت نے لکھا کہ:

الطاغوت کل معبود من دون اللہ و کل راس فی الضلال(۱)

''طاغوت وہ ہوتا ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہو اللہ کے علاوہ اور جو ضلالت کا رئیس ہو۔''

قرآن وسنّت کی بالادستی سے منحرف حکمران سے بڑا رئیسِ ضلالت اور کون ہوسکتا ہے؟ مشہور تابعی اور ابن عباسؓ کے شاگرد حضرت مجاہد بن جبر فرماتے ہیں:

الطاغوت الشیطان فی صورۃ انسان یتحاکمون الیه و ھو صاحب امرھم(۲)

''طاغوت شیطان کی شکل میں انسان ہوتا ہے جس کے پاس لوگ اپنے تنازعات فیصلہ کرانے کے لیے لے جاتے ہیں اور وہ ان کا حکم اور صاحبِ امر ہوتا ہے۔''

ابن جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ) نے لکھا ہے کہ:

---

(۱) الصحاح للجوھری ولسان العرب للافریقی

(۲) تفسیر ابن کثیر' سورۃ النساء۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 14 (1,1)

والصواب من القول فی الطاغوت عندی انه کل ذی طغیان علی اللہ فعبد من دونه اما بقهر منه لمن عبده و اما بطاعة ممن عبده له انسانا کان او شیطانا[۱]

''میرے نزدیک طاغوت کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ اللہ کے مقابلے میں ہر سرکشی کرنے والا طاغوت ہوتا ہے جس کی اللہ کے علاوہ اطاعت کی جاتی ہو' خواہ اس نے جبراً لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا ہو یا لوگ اپنی خوشی سے اس کی اطاعت کرتے ہوں' خواہ وہ انسان ہو یا شیطان (جن) ہو۔''

طاغوت کے صحیح مفہوم کے بعد یہ سوال غیر متعلق بن جاتا ہے کہ حکومت کو عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہے یا نہیں؟ اور مسلمان رعایا اس کی حکومت پر مجتمع ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ جو حکومت بھی اللہ ورسول کے احکام سے انحراف اور بغاوت اختیار کر لے وہ طاغوت کی تعریف میں شامل ہو جاتی ہے' خواہ وہ استبدادی بادشاہت اور آمریت ہو یا فوجی ڈکٹیٹر شپ ہو اور خواہ وہ جمہوری طریقے سے منتخب حکومت ہو یا احبار و رُہبان کی پاپائیت اور تھیوکریسی ہو۔ اس تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے تو پاکستان کی موجودہ حکومت طاغوت ہے' الجماعۃ نہیں ہے' اور اس کی خیر خواہی اور وفاداری کا التزام طاغوت کا التزام ہے' التزامِ الجماعۃ نہیں ہے' اس لیے کہ یہ حکومت نہ صرف یہ کہ قرآن وسنّت کا التزام نہیں کرتی بلکہ حدود اللہ اور شعائر اللہ کا مذاق اڑاتی ہے۔ اگرچہ پاکستان کا آئین اپنی بنیادی دفعات کے اعتبار سے اسلامی آئین ہے لیکن حکومت غیر اسلامی ہے جو قرآن وسنّت اور ملکی آئین دونوں سے منحرف ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ حکومت بالفعل ہے مگر حکومت بالحق نہیں ہے۔ جو لوگ اس کو بھی الجماعۃ قرار دے کر اس کی وفاداری اور خیر خواہی کو تقاضائے شریعت قرار دیتے ہیں وہ ایک طاغوت کو مذہب کا سہارا دے رہے ہیں۔

قرآن وسنّت پر فیصلہ نہ کرنے والوں کو اللہ نے خود کافر' ظالم اور فاسق کہا ہے:

﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ﴿۴۴﴾...... ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴿۴۵﴾...... ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ﴿۴۷﴾﴾

''اور جو بھی اللہ کے نازل کردہ قانون پر فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں...... وہی ظالم ہیں...... وہی فاسق ہیں۔''

---

(۱) تفسیر ابن جریر' البقرۃ:۲۵۶۔

ان آیات میں ''وَمَنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنۡ'' کا لفظ نہیں آیا بلکہ ''وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ'' کا لفظ آیا ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ''جو لوگ ایمان نہیں لاتے'' بلکہ یوں فرمایا ہے کہ ''جو لوگ فیصلہ نہیں کرتے''۔ تو معلوم ہوا کہ عقیدہ جو بھی ہو مگر جب عملاً قرآن و سنّت پر فیصلے نہیں کرتے اور حکومت کے نظام میں قرآن و سنّت کا التزام نہیں کرتے تو وہ کافر' ظالم اور فاسق ہیں اور ظالم لوگ حکومت اور امامت کے مستحق نہیں ہوتے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے جواب میں اللہ نے فرمایا تھا: ﴿لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ﴾ یعنی ظالم لوگ امامت کے حق دار نہیں ہیں۔

البتہ یہ فرقِ مراتب ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جو لوگ ایمان ہی نہیں لائے ہیں وہ اعتقاداً کافر ہیں اور جو لوگ قرآن و سنّت پر اعتقاد اور ایمان تو رکھتے ہیں مگر عملاً قرآن و سنّت پر فیصلہ نہیں کرتے تو وہ عملی کفر' عملی ظلم اور عملی فسق کے مرتکب ہیں۔ اعتقادی اور عملی کفر کا فرق اُخروی سزا کے اعتبار سے تو ہے کہ ایک ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا اور دوسرا ہمیشہ نہیں رہے گا' لیکن اس دنیا میں امامت و قیادت کا اہل کافر اور ظالم نہیں ہے' خواہ اعتقادی کفر و ظلم میں مبتلا ہو یا عملی کفر و ظلم کا مرتکب ہو۔ اور جو لوگ سیکولر سیاست کے قائل ہوں اور سیاست و حکومت میں قرآن و سنّت کی بالادستی کو ذہناً بھی تسلیم نہ کرتے ہوں' بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہو کہ سیاست میں دین و مذہب کا کوئی دخل نہیں ہے' وہ تو اعتقادی اور فکری کفر کے مرتکب ہیں۔ ان کی اہلیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امام جصاصؒ' امام رازیؒ اور امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ ظالم اور فاسق حکومت کا مستحق نہیں۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے:

﴿وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا ﴿۲۴﴾﴾ (الدھر)

''اور ان میں سے کسی گناہ کرنے والے اور ناشکری کرنے والے کی اطاعت نہ کرو۔''

﴿وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ وَکَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾﴾ (الکھف)

''اور اُس کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کے کام حد سے گزرے ہوئے ہیں۔''

﴿وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٥١﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿١٥٢﴾﴾ (الشّعراء)

''اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو حد سے آگے نکل گئے ہیں اور جو زمین میں فساد کرتے ہیں' اصلاح نہیں کرتے''۔

جب اللہ تعالیٰ نے قرآن وسنّت پر فیصلہ نہ کرنے والوں کو کفر' ظلم اور فسق کے مرتکب قرار دیا ہے اور آثِم و کَفُور اور مُسرِف ومُفسِد کی اطاعت سے منع کر دیا ہے تو آخر ایسے لوگوں کی حکومت الجماعۃ کیسے ہو سکتی ہے؟ جس کا التزام و وفاداری ایمان کا تقاضا ہے اور شریعت کا حکم ہے۔ احادیث تو اس موضوع پر کافی ہیں لیکن حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی درجِ ذیل حدیث پر اکتفا کرتا ہوں:

قَالَ دَعَانَا النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَبَایَعْنَاہُ فَقَالَ فِیْمَا اَخَذَ عَلَیْنَا اَنْ بَایَعَنَا عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِیْ مَنْشَطِنَا وَمَکْرَھِنَا وَعُسْرِنَا وَیُسْرِنَا وَاَثَرَۃً عَلَیْنَا وَاَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ))[1]

''حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ہم کو نبی ﷺ نے بلایا تو ہم نے آپؐ سے بیعت کر لی۔ آپؐ نے ہم پر جو شرطیں لگائی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہم اپنے امیر کی بات سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے' خوشی کی حالت میں بھی اور ناخوشی کی حالت میں بھی' تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی اور اس حالت میں بھی کہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے' اور یہ کہ ہم حکومت و امارت کے بارے میں اس کے اہل کے ساتھ جھگڑا نہیں کریں گے سوائے اس صورت کے کہ تم اس میں ایسا کھلا کفر دیکھ لو جس کے کفر ہونے پر تمہارے پاس اللہ کی جانب سے قطعی دلیل موجود ہو''

جو حکومت قرآن وسنّت سے منحرف ہو چکی ہو اور ریاست کا نظام سیکولرازم اور لادین سیاست کے اصولوں پر چلا رہی ہو اس کے اس طرزِ عمل کے کفرِ بواح ہونے کی برہان وہ آیات ہیں جن کا ذکر چند سطور قبل ہو چکا ہے کہ ایسی حکومت طاغوت ہے' کافر ہے' ظالم ہے اور فاسق ہے۔ جو سکالر یہ کہتے ہیں کہ عامۃ الناس کی معتمد حکومت اگر کفر بواح کی مرتکب ہو پھر بھی وہ ''الجماعۃ'' ہے وہ اس حدیث پر غور فرمائیں کہ اس میں یہ بات کہاں ہے کہ جس

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الفتن' و صحیح مسلم 'کتاب الامارۃ۔

حکومت کو عوام کا اعتماد حاصل ہو وہ اگر کفر بواح کا ارتکاب کرے پھر بھی اس کا التزام کیا جائے؟ باقی رہی شورائیت کے بارے میں آیات واحادیث تو ان کا مفہوم تو یہ ہے کہ اسلامی حکومت مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رائے سے بنے گی اور مشورے سے چلے گی۔ سیکولر جمہوریت کا اصول تو یہ ہے کہ جب تک عوام کا اعتماد کسی حکومت کو حاصل ہو اُس وقت تک اس کو حکومت کرنے کا حق حاصل رہتا ہے' لیکن اسلام کے شورائی نظام کا اصول تو یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی معتمد حکومت اگر اللہ ورسول کے احکام سے باغی ہو جائے پھر بھی وہ اسلامی حکومت ہو گی اور اس کے ساتھ چمٹے رہنا دین وایمان کا تقاضا ہو گا!

(٦) الجماعۃ بمعنی اہل سنّت والجماعۃ

احادیث میں ''الجماعۃ'' کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوا ہے جو فکر وعمل کے اعتبار سے سنّتِ رسولؐ اور سنّتِ اصحابِ رسولؐ کا التزام کرتے ہیں' جن کو اصطلاحاً اہل سنّت والجماعۃ کہا جاتا ہے۔ ''الجماعۃ'' کا یہ مفہوم اس حدیث سے ماخوذ ہے جو حدیثِ افتراقِ اُمّت کے نام سے مشہور ہے۔

حدیثِ افتراقِ اُمّت اور اس کا مفہوم

عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ : اَلَا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَامَ فِيْنَا فَقَالَ : ((اَلَا اِنَّ مَنْ قَبْلَكُمْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوْا عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَاِنَّ هٰذِهِ الْمِلَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَسَبْعِيْنَ' ثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِى النَّارِ وَ وَاحِدَةٌ فِى الْجَنَّةِ وَهِىَ الْجَمَاعَةُ)) وَفِىْ رِوَايَةٍ : ((وَاِنَّهٗ سَيَخْرُجُ مِنْ اُمَّتِىْ اَقْوَامٌ تَجَارٰى بِهِمْ تِلْكَ الْاَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ لِصَاحِبِهٖ ـــــ وَقَالَ عَمْرٌو الْكَلْبُ بِصَاحِبِهٖ ـــــ لَا يَبْقٰى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَا مَفْصِلٌ اِلَّا دَخَلَهٗ)) [1]

''حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر فرمایا: ''لوگو سنو! جو اہل کتاب تم سے پہلے گزر چکے ہیں وہ ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور یہ ملت (میری اُمّت) ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے ۷۲ دوزخ میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا' یہی جنت میں جانے والے ''الجماعۃ'' ہیں۔'' دوسری روایت میں اس کے بعد آپؐ کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں کہ:

---

(١) سنن ابی داوٗد' کتاب السنة' باب شرح السنة

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.isp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 16 (1,1)

”میری اُمّت میں ایسے گروہ بھی ظاہر ہوں گے جن کے اندر یہ خواہشاتِ نفس اس طرح پھیل جائیں گی جس طرح کہ پاگل کتے کے کاٹے ہوئے شخص کے جسم میں اس کے جراثیم پھیل جاتے ہیں کہ اس کی کوئی رگ اور بند ایسا نہیں ہوتا جس میں جراثیم داخل نہ ہوئے ہوں۔“

ترمذی کی روایت میں آیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا:

مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِىْ)) (۱)

”یارسول اللہ! یہ کون سی جماعت ہوگی؟ تو آپؐ نے فرمایا: ”یہ وہ جماعت ہوگی جو میری سنّت اور میرے اصحاب کی سنّت پر قائم ہو۔“

ایک دوسری حدیث میں اس ”الجماعۃ“ کو ”السواد الاعظم“ کا نام دیا گیا ہے۔ تفرقِ اُمّت کی یہ حدیث ترمذی‘ ابوداؤد‘ ابن ماجہ‘ مسند احمد‘ صحیح ابن حبان اور مستدرک میں نقل ہوئی ہے۔ اس کے بعض طرق صحیح ہیں‘ بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف بھی ہیں۔ حافظ شمس الدین سخاویؒ (متوفی ۹۰۲ھ) نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ۱۵ صحابہ سے اسانید کثیرہ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ (۲)

اسی مضمون کی ایک حدیث نسائی‘ مسند احمد‘ دارمی اور دوسری کتابوں میں نقل ہوئی ہے جس میں اللہ کے راستے کے آس پاس شیطانی راستوں کا ذکر ہوا ہے‘ مگر اُن راستوں کی تعداد نہیں بتائی گئی۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَطًّا ثُمَّ قَالَ : ((هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ)) ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ: ((هٰذَا سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْ اِلَيْهِ)) وَقَرَأَ: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ج وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ط﴾ (الانعام:۱۵۳) (۳)

”ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سمجھانے کے لیے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا کہ: ”یہ اللہ کا راستہ ہے“۔ پھر اس کے دائیں بائیں لکیریں کھینچیں اور فرمایا کہ: ”یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر راستے پر ایک شیطان بیٹھا ہوا

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب الایمان عن رسول اللّٰہ‘ باب ما جاء فی افتراق ھذہ الاُمۃ۔

(۲) المقاصد الحسنہ‘ ص ۱۵۸‘ بیروت‘ ۱۹۸۶ء۔

(۳) مشکوٰۃ‘ باب الاعتصام‘ فصل ثالث۔

ہے جو لوگوں کو اپنے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے''۔اس تمثیل کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی کہ:''یہ میرا راستہ ہے' اسی پر چلتے رہو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو' یہ تم کو اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تمثیل میں سبیل اللہ کو خطِ مستقیم سے تشبیہہ دی ہے اور قرآن کریم میں ان کے اس راستے کو صراط مستقیم' قصد السبیل اور اَلَّتِیۡ هِیَ اَقۡوَمُ کہا گیا ہے۔یعنی سیدھا و کشادہ اور افراط و تفریط کے درمیان اعتدال و توازن پر مبنی راستہ یہی قرآن و سنّت کا راستہ ہے۔اور شیطانی راستوں کو ان ترچھی اور ٹیڑھی لکیروں سے تشبیہہ دی ہے جو خط مستقیم کے دائیں بائیں کھینچی گئی ہیں۔ یہ ان بدعتی فرقوں کے راستے ہیں جنہوں نے اپنا رابطہ اسلام سے بالکل منقطع نہیں کیا بلکہ اسلام کی شاہراہ سے اپنے لیے رابطہ سڑکیں بنالی ہیں۔

افتراقِ اُمّت کی حدیث میں جن ۷۲ فرقوں کا ذکر ہوا ہے وہ بھی اُمّت مسلمہ اور اہل قبلہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر انہوں نے خواہشِ نفس اور قرآن و سنّت کی نصوص میں تکلفی تاویلات کی بنا پر سنتِ رسولؐ اور سنتِ اصحابِ رسولؐ کے خلاف بدعات وضلالات کے راستے نکال لیے ہیں اور ان پر چل پڑے ہیں۔ان میں سے خوارج اور روافض اور بعض دوسرے فرقے سیاسی مقاصد رکھتے تھے اور کچھ دوسرے عوامل کی وجہ سے بنے تھے۔مقاصد اور عوامل جو بھی تھے ان کی تفصیل اس وقت پیش نظر نہیں ہے' مگر تھے یہ بدعتی فرقے جنہوں اسلام سے اپنا تعلق توڑے بغیر سوادِ اعظم سے اپنے راستے الگ کر دیے تھے۔حدیث میں یہ نہیں آیا کہ اُمّت میں ہمیشہ کے لیے ۷۲ فرقے رہیں گے اور ان میں کمی بیشی کبھی نہیں ہو گی۔بعض شارحین حدیث نے تو کہا ہے کہ ۷۲ سے یہ مخصوص عدد مراد نہیں ہے' بلکہ یہ کنایہ ہے کثرت سے اور مراد یہ ہے کہ میری اُمّت میں بہت سے فرقے اور چھوٹے بڑے گروہ پیدا ہو جائیں گے جو میری اور میرے اصحاب رضی اللہ عنہم کی سنت کا التزام نہیں کریں گے' بلکہ ہوائے نفس پر مبنی فلسفیانہ خیالات رکھیں گے۔جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

((فَاِنَّهٗ مَنۡ يَعِشۡ مِنۡكُمۡ فَسَيَرَى اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا فَعَلَيۡكُمۡ بِسُنَّتِيۡ وَسُنَّةِ الۡخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيۡنَ الۡمَهۡدِيِّيۡنَ))

''لیکن تم میں سے جو زندہ رہا تو بہت سے اختلافات دیکھ لے گا۔پس اُس وقت تم میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کا التزام کرو۔''

لیکن اکثر شارحین نے ۷۲ کا عدد مراد لیا ہے' مگر یہ کسی نے بھی نہیں کہا کہ اُمّت میں ہمیشہ

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.isp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 17 (1,1)

کے لیے یہی فرقے رہیں گے‘ نہ کم ہوں گے اور نہ زیادہ ہوں گے۔ اس لیے کہ حدیث میں یہ بات موجود ہی نہیں ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہی تعداد رہے گی۔ یہ ۷۲ بدعتی فرقے کون ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے نہ ان کے نام بتائے ہیں نہ ان کے عقائد و نظریات کی تفصیلات بتانا ضروری سمجھا ہے‘ بلکہ صرف ایک جامع قسم کی صفت اور علامت بتا دی ہے جس سے وہ پہچان لیے جائیں گے اور وہ صفت و علامت یہ ہے کہ وہ سنت رسولؐ‘ سنت خلفاء راشدین اور سنت اصحابِ رسولؐ کا التزام نہیں کریں گے بلکہ ہوائے نفس کا اتباع کریں گے۔ چنانچہ جب یہ فرقے نمودار ہوئے تو مسلمانوں نے پہچان لیے اور محدثین نے ان کے نام اور عقائد معلوم کر کے بتا دیے تاکہ اُمّت ان سے اجتناب کرے۔

اہل بدعت کے ۷۲ فرقے

چوتھی صدی ہجری کے ایک عالم ہیں جو ابن **بطۃ** عکبری کے نام سے مشہور ہیں۔ ’’**بطۃ**‘‘ ان کے اجداد میں سے کسی کا لقب تھا اور عکبر بغداد سے ۵ فرسخ کے فاصلے پر دریائے دجلہ کے ساحل پر ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ انہوں نے یوسف بن اسباطؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ:

> اصل البدع اربعة : الروافض‘ والخوارج‘ والقدرية والمرجئة....(۱)
>
> ’’تمام بدعتی فرقوں کے اصل فرقے چار ہیں: روافض (شیعہ) خوارج‘ قدریہ (معتزلہ) اور مرجئہ۔ باقی جتنے چھوٹے بڑے فرقے اور گروہ بنے ہیں وہ انہی چار کی ذیلی شاخیں اور گروپ ہیں جو الگ الگ ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔‘‘

لیکن علم الکلام کی معروف کتاب المواقف میں لکھا ہے کہ:

> وكبار الفرق الاسلامية ثمانية : المعتزلة والشيعة والخوارج والمرجئة والنجارية والجبرية والمشبهة والناجية
>
> ’’بڑے اسلامی فرقے آٹھ ہیں: معتزلہ‘ شیعہ‘ خوارج‘ مرجئہ‘ نجاریہ‘ جبریہ‘ مشبہہ اور ناجیہ (یعنی نجات پانے والی جماعت اہل سنت والجماعۃ)۔‘‘

اس کے بعد اِن آٹھ فرقوں کی ذیلی شاخوں اور گروپوں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

معتزلہ: ۲۰	شیعہ: ۲۲	خوارج: ۲۰	مرجئہ: ۵	
نجاریہ: ۳	جبریہ: ۱	مشبہہ: ۱	ناجیہ: ۱	کُل: ۷۳

(۱) الابانة عن شريعة الفرق الناجية‘ طبع بيروت ۱۹۸۸ء‘ ص ۳۷۷‘ ج ۱۔

ان ۲۷ فرقوں سے منسلک لوگ مجموعی طور پر بھی ہر دَور میں ''الجماعۃ'' اور ''السواد الاعظم'' سے منسلک مسلمانوں کے مقابلے میں ۵ فیصد سے بھی کم رہے ہیں۔ اور آج تو سوائے شیعہ کے مذکورہ ناموں سے موسوم غالباً ایک فرقہ بھی دنیا میں موجود نہیں ہے۔ مشہور اسلامی فرقے تو آج صرف دو ہیں: ایک اہل سنت والجماعۃ اور دوسرا شیعہ۔ مگر یہ بات کبھی بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ اہل سنت میں تمام وہ مکاتب فقہ شامل ہیں جو سنتِ رسولؐ اور سنت اصحابؓ رسولؐ کا عقیدہ اور عمل دونوں میں التزام ضروری سمجھتے ہیں۔ حنفیہ' شافعیہ' مالکیہ' حنابلہ' اہل حدیث اور اہل ظاہر سب اہل سنت والجماعۃ میں شامل ہیں۔ اسی طرح پاکستان اور عالم اسلام کی وہ تمام اسلامی تحریکیں اور دینی تنظیمیں جو مذکورہ اصول کا التزام کرتی ہیں' جس نام سے بھی موسوم ہوں سب کی سب اہل سنت والجماعۃ میں شامل ہیں اور سب ایک بہت بڑی عالمی نظریاتی جماعت یعنی الجماعۃ کے اعضاء ہیں اور اس کی ذیلی برادر تنظیمیں ہیں۔ فروع و جزئیات میں تعبیر و اجتہاد کے تنوع کی وجہ سے جو اختلافِ آراء اہل سنت کے مکاتب فقہ کے درمیان موجود ہے یا طریقہ کار' حکمت عملی اور تدابیر کا جو تنوع اہل سنت کی ذیلی برادر تنظیموں اور تحریکوں میں نظر آ رہا ہے یہ اہل سنت کے ملتِ واحدہ اور الجماعۃ ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اہل بدعت ۲۷ فرقوں کے افکار اور خیالات کی تفصیل شرح مواقف' الاعتصام للشاطبیؒ اور الملل والنحل کی کتابوں میں شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئی ہے' لیکن یہ تفصیل اس وقت موضوع سے کچھ زیادہ تعلق بھی نہیں رکھتی اور اس کی اب وہ افادیت بھی نہیں رہی جو ان فرقوں کے ظہور کے وقت تھی۔ آج کل نفاذِ شریعت کے مخالفین اور سیکولرازم کے مؤیدین کہتے پھرتے ہیں کہ کس فرقے کی شریعت نافذ کریں؟ اسلام میں تو ۷۳ فرقے ہیں! یہ بات کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اسلامی نظام اور نفاذِ شریعت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو ۷۳ فرقوں کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکے ہیں۔ اس لیے کہ اسلام کا تحقیقی علم تو دینی مدارس میں حاصل کیا جا سکتا ہے اور انہوں نے فرنگی طرز کی ملکی یا غیر ملکی یونیورسٹیوں میں علم حاصل کیا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو جواب دینے کے لیے اور دوسری قسم کے مسلمانوں کو سمجھانے کے لیے عرض ہے کہ یہ برائے نام ۷۲ فرقے' بلکہ اگر اِن کے مزید ذیلی گروپوں کو شمار کیا جائے تو اس سے بھی زیادہ فرقے' مجموعی طور پر اہل سنت کے مقابلے میں ۵ فیصد سے بھی کم رہے ہیں اور آج ان کا دنیا میں نام بھی باقی نہیں رہا۔ اصل ملت واحدہ

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 18 (1,1)

وہی ہے جس کو ''ناجیہ'' کہا گیا ہے اور وہ ہے ''الجماعۃ'' بمعنی اہل سنت والجماعۃ۔ اس وقت تو عملاً دو ہی اسلامی فرقے ہیں: شیعہ اور سنی۔ اور دونوں کے ممتاز اور نمائندہ ۳۱ علماء نے جنوری ۱۹۵۱ء میں اسلامی ریاست کے لیے ۲۲ دستوری نکات پر مکمل اتفاق کر لیا تھا۔ اور ۲۳/اپریل ۱۹۹۵ء کو ملی یک جہتی کونسل کے اجلاس منعقدہ لاہور میں دونوں کے ۷۰ ممتاز اور نمائندہ علماء نے اِن ۲۲ نکات پر دوبارہ دستخط کر دیے ہیں اور کونسل کے منظور کردہ سترہ نکاتی ضابطۂ اخلاق میں پہلا نکتہ اِن ۲۲ نکات کی توثیق ہے۔ ''خوئے بد بہانہ بسیار'' کے طور پر سیکولرازم کے پجاریوں کا یہ ۷۳ فرقوں والا بہانہ بھی اب ختم ہو گیا ہے۔ عملاً تو سوائے شیعہ کے اہل بدعت کے فرقے موجود ہی نہیں ہیں' لیکن افتراقِ اُمّت کی صحیح حدیث کو سمجھنے کے لیے ایک سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔

سوال: رسول اللہ ﷺ نے الجماعۃ کے علاوہ باقی ۷۲ فرقوں کو دوزخی کہا ہے۔ دوسری طرف ان کو اپنی اُمّت اور ملت بھی کہا ہے کہ میری اُمّت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ تو دوزخی فرقے رسول اللہ ﷺ کی اُمّت کیسے ہو سکتے ہیں؟

جواب: دوزخ کی آگ کی نسبت صرف کفر بواح کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ قرآن و سنت کی متعدد نصوص میں دوزخ' لعنت اور قہر و غضب کی نسبت ان مسلمانوں کی طرف بھی کی گئی ہے جو سنتِ رسولؐ اور سنتِ اصحابِ رسولؐ کا التزام نہیں کرتے' اگرچہ اسلام کے قطعی عقائد کو مانتے ہیں' کبائر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ البتہ ان بدعتی لوگوں میں سے ایسے بھی تھے جو کفر بواح کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ تو ملت اسلامیہ سے خارج اور خلود فی النار یعنی دوزخ میں ہمیشہ رہنے کے مستحق ہیں' لیکن ان فرق ضالہ میں سے جو کفر بواح کا عقیدہ تو نہیں رکھتے تھے مگر اپنی تاویل فاسد کی بنا پر اعتقاد فاسد رکھتے تھے وہ مسلمان ہونے کے باوجود دخول فی النار یعنی دوزخ میں کچھ وقت کے لیے داخل ہونے کے مستحق تھے اس لیے حدیث میں ان کو فِی النَّار کہا گیا ہے۔ باقی رہے اہل سنت کے وہ لوگ جو کبائر کے ارتکاب اور فرائض کے ترک میں مبتلا ہوں وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے دخول فی النار کے مستحق ہوتے ہیں' اعتقادِ فاسد کی وجہ سے اس کے مستحق اس لیے نہیں ہوتے کہ عقیدتاً تو وہ الجماعۃ میں شامل ہوتے ہیں جو جماعت ناجیہ ہے۔ کُلُّھُمْ فِی النَّار کی یہی تحقیق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے کی ہے اور اس کو محققین کا قول کہا ہے۔ (۱)

---

(۱) لمعات التنقیح شرح مشکوٰۃ المصابیح' ص ۲۳۵' ج ۱۔

اہل سنت والجماعۃ کا صحیح مفہوم

جماعت ناجیہ کو بعض احادیث میں ''الجماعۃ'' کہا گیا ہے' بعض میں ''السوادالاعظم'' کہا گیا ہے اور بعض میں ''مَا اَنَا عَلَیۡهِ وَاَصۡحَابِیۡ'' کہا گیا ہے۔ ان تینوں کا مفہوم ایک ہے۔ اس لیے کہ ''الجماعۃ'' میں الف لام عہد کے لیے ہے اور مراد ہے وہ جماعت جو سنتِ رسولؐ اور سنتِ اصحابؓ رسولؐ پر قائم ہو۔ یہ جماعت بدعتی فرقوں کے مقابلے میں ہر دَور میں اکثریت ہی میں نہیں بلکہ غالب ترین اکثریت میں رہی ہے' اس لیے اس کو ''السوادالاعظم'' کا نام بھی دیا گیا ہے' یعنی بڑی جماعت۔ لیکن الاعظم کے معنی اعظم شاناً ورفعتاً بھی آتے ہیں' یعنی بڑی شان اور رفعت ودرجے والی جماعت' اگرچہ اس کی تعداد سب سے کم ہو۔ احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے قریب ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ حق پر قائم رہنے والے مسلمان بہت کم ہوں گے اور معاشرے میں وہ غریب اور اجنبی ہوں گے۔ الجماعۃ کا یہ مفہوم (یعنی اہل سنت والجماعۃ) اس حدیث سے بھی ماخوذ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((وَلَنۡ تَزَالَ هٰذِهِ الۡاُمَّةُ — وَفِیۡ رِوَایَةٍ : لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنۡ اُمَّتِیۡ — وَفِیۡ رِوَایَةٍ : لَا تَزَالُ مِنۡ اُمَّتِیۡ اُمَّةٌ قَائِمَة عَلٰی اَمۡرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمۡ مَنۡ خَالَفَهُمۡ — وَفِیۡ رِوَایَةٍ : مَنۡ خَذَلَهُمۡ حَتّٰی یَاۡتِیَ اَمۡرُ اللّٰهِ)) (۱)

''میری اُمّت میں سے ایک جماعت اللہ کے دین پر قائم رہے گی اور مخالفت کرنے والے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے (دین سے نہیں ہٹا سکیں گے) یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا۔''

اس مضمون کی متعدد احادیث حضرات معاویہ' مغیرہ بن شعبہ' ثوبان' جابر بن سمرہ' جابر بن عبداللہ' عقبہ بن عامر اور عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہم سے بخاری ومسلم میں نقل ہوئی ہیں کہ یہ کون سی جماعت ہے جس کا تسلسل برقرار رہے گا اور وقت مقررہ تک دنیا سے ان کا وجود مٹایا نہیں جا سکے گا؟

امام بخاری نے تو کتاب الاعتصام کے ایک ترجمۃ الباب میں اپنی رائے یہ دی ہے: ھم اھل العلم ''یہ اہل علم ہیں''۔ ابن حجر اور امام نووی نے امام احمد بن حنبل کا قول نقل کیا ہے کہ:

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم و کتاب الاعتصام و کتاب المناقب۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2016 4:44 PM PAGE 19 (1,1)

ان لم یکو نوا اھل الحدیث فلا ادری من ھم؟ وقال عیاض اراد احمد بن حنبل اھل السنة والجماعة.

''اگر یہ اہل حدیث نہیں ہیں تو میں نہیں جانتا کہ اور کون ہو سکتے ہیں؟ قاضی عیاض نے فرمایا کہ امام احمد کی مراد اہل سنت والجماعت ہیں''۔

امام بخاری اور امام احمد کے اقوال میں صرف تعبیر کا فرق ہے۔ اس لیے کہ اہل حدیث یعنی اہل سنت کی دینی اور فکری قیادت ظاہر ہے کہ اہل علم ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی علمی قیادت کے بغیر تو وہ دین پر قائم نہیں رہ سکتے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ:

''ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے افراد ایک ہی مقام پر کام کرتے ہوں' بلکہ یہ زمین کے اقطار واطراف میں پھیلے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔ کچھ ان میں سے بہادر اور دلیر مجاہد ہوں گے' کچھ فقہاء اور محدثین ہوں گے' کچھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتے ہوں گے اور کچھ خیر اور بھلائی کے دوسرے کام کرتے ہوں گے۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ یہ صورت حال دَورِ نبویؐ سے لے کر آج تک قائم رہی ہے اور اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ کا وہ حکم نہ آ جائے جس کا ذکر حدیث میں ہوا ہے۔''(۱)

اللہ کے جس حکم کا حوالہ اس حدیث میں دیا گیا ہے اس کا ذکر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ:

''پھر اللہ تعالیٰ ایسی ہوا بھیج دے گا جو مشک کی طرح خوشبودار اور ریشم کی طرح نرم ہو گی' اور جب ایسے شخص پر گزرے گی جس کے دل میں ایک دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو اس کی روح قبض کرے گی۔ اس کے بعد زمین پر بدترین لوگ ہی رہ جائیں گے اور اُن پر قیامت قائم ہو جائے گی۔''(۲)

اس سلسلے میں ایک دوسری مشہور حدیث بھی قابل غور ہے جو ایک طویل حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے پہلے ان پانچ احکام کا ذکر فرمایا ہے جن پر عمل کرنے اور بنی اسرائیل کو ان پر عمل کرنے کی ترغیب دلانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دیا تھا اور انہوں نے بیت المقدس میں ایک اجتماع بلا کر وہ احکام بیان فرمائے تھے۔ وہ پانچ احکام تھے: عقیدۂ توحید' نماز' روزہ' صدقہ اور اللہ کا ذکر۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَاَنَا آمُرُ کُمْ بِخَمْسٍ اللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ : اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ وَالْجِھَادُ

(۱) شرح مسلم' کتاب الامارۃ۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ۔

وَالْهِجْرَةُ وَالْجَمَاعَةُ ، فَاِنَّهُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ اِلَّا اَنْ يَرْجِعَ ، وَمَنِ ادَّعٰى دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَاِنَّهُ مِنْ جُثَا جَهَنَّمَ)) فَقَالَ رَجُلٌ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنْ صَلّٰى وَصَامَ ؟ قَالَ : ((وَاِنْ صَلّٰى وَصَامَ فَادْعُوْا بِدَعْوَى اللّٰهِ الَّذِیْ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ عِبَادَ اللّٰهِ)) [1]

''اور میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے: سننا' ماننا' جہاد کرنا' ہجرت کرنا' اور الجماعۃ کا التزام کرنا' اس لیے کہ جو شخص الجماعۃ سے بالشت برابر بھی الگ ہوا تو اس نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیا الا یہ کہ دوبارہ لوٹ آئے۔ اور جو لوگ جاہلیت (نسلی عصبیت) کی دعوت دیتے ہیں تو وہ جہنمی جماعتیں ہیں''۔ ایک شخص نے پوچھا کہ اگرچہ وہ نماز پڑھتے ہوں اور روزہ رکھتے ہوں؟ فرمایا: ''اگرچہ نماز پڑھتے ہوں اور روزہ رکھتے ہوں۔ پس اللہ کے بندو! تم لوگوں کو اللہ کی جانب بلاؤ جس نے تم کو مسلمین اور مؤمنین کا نام دیا ہے۔''

ترمذی کے مشہور شارح قاضی ابن العربی فرماتے ہیں کہ سمع سے مراد کانوں سے سننا نہیں ہے بلکہ دل سے قبول کرنا مراد ہے' ورنہ کانوں سے سننا اور دل میں قبول نہ کرنا تو منافقین کی عادت ہے: ﴿الَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ﴾ (الانفال:۲۱) ''جو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے' حالانکہ وہ دل میں قبول نہیں کرتے''۔ ''الطاعۃ'' سے مراد ہے عمل کرنا جو دل سے قبول کرنے کی نشانی ہے۔ جہاد اور ہجرت کے معنی معروف و معلوم ہیں' اور التزامِ جماعت کے معنی ہیں:

لزوم الطريقة التى يتمسک بها الناس ولا يكون المرء شاذا خارجا عن منها جهم و هذه الجماعة هى الصحابة والتابعون والا خيار المسلمون فى جادة الدين ومنهاج الحق المبين [2]

(۱) سنن الترمذی' ابواب الامثال۔ ومسند احمد' طبع دار صادر' ص ۲۰۲'۳۰' ج۴۔ والصحیح لابن خزیمه 'ص ۱۹۵' ج۳۔ وموارد الظمآن بزوائد ابن حبان' ص ۲۹۹۔ والسنن الکبریٰ للبیهقی' ص۱۵۷' ج۸۔ وشرح السنة للبغوی' ص ۵۱' ج۱۰۔ ومشکوٰة المصابیح' کتاب الامارة' فصل ثانی۔

(۲) عارضة الاحوذی' شرح ترمذی' ابواب الامثال

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 20 (1,1)

''اس طریقے کا التزام کرنا جس پر دوسرے لوگ عمل کرتے ہیں اور یہ کہ انسان ان کے راستے سے الگ نہ رہے۔ یہ الجماعۃ (جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے) صحابہ وتابعین اور بہترین مسلمانوں کی جماعت ہے جو دین اور حق کی شاہراہ پر قائم رہتے ہیں۔''

علامہ طیبیؒ (متوفی ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں:

قوله بالجماعة المراد بهم الصحابة اى آمركم بالتمسک بهديهم والانخراط فى زمر تهم......قوله قيد شبر......والمعنى ان من فارق الجماعة بترک السنة وارتکاب البدعة ولو بشيئ يسير نقض عهد الاسلام ونزع اليدعن الطاعة(۱)

''الجماعۃ سے مراد صحابہؓ ہیں' یعنی میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ جماعتِ صحابہؓ کے طریقے پر قائم رہو اور اپنے آپ کو ان کی جماعت سے منسلک رکھو...... بالشت برابر الگ رہنے سے مراد یہ ہے کہ جو بھی سنت کے ترک کرنے اور بدعت کے ارتکاب کی وجہ سے الجماعۃ سے جدا ہوا' اگرچہ بہت تھوڑا سا الگ ہوا ہو' تو اس نے اسلام کا عہد توڑ لیا اور اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا''۔

ملا علی قاری (متوفی ۱۰۲۴ھ) نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (متوفی ۱۳۵۳ھ) نے تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں بھی اسی طرح کی تشریح کی ہے۔ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلامی حکومت پر مجتمع ومتحد ہونے والے مسلمانوں کو بھی الجماعۃ کہا جاتا ہے اور التزامِ جماعت کی ہیئت کاملہ اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ لیکن احادیث میں الجماعۃ کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوا ہے جو سنت رسولؐ اور سنت صحابہؓ کا التزام کرتے ہوں جن کو اہل سنت والجماعۃ کہا جاتا ہے' اگرچہ ان کے پاس حکومت اور اقتدار موجود نہ ہو۔ اور التزامِ جماعت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اہل سنت والجماعۃ کے اُصولوں کی پابندی کی جائے اور ان سے خروج وشذوذ نہ کیا جائے۔ لیکن یہاں پر دو سوال پیدا ہو سکتے ہیں جن کا حل کرنا ضروری ہے۔

سوال (۱): جب ان کی اپنی اسلامی حکومت نہیں ہو گی تو پھر کس چیز پر مجتمع ہوں گے؟

جواب: وہ ''مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِیْ'' پر مجتمع ہوں گے' یعنی ان اُصول وعقائد پر ان کا اجتماع واتحاد ہو گا جو سنت رسولؐ اور اجماعِ صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ اصول وافکار پر مجتمع

---

(۱) الکاشف عن حقائق السنن' شرح مشکوٰۃ' ص ۲۰۰' ۲۰۱' ج ۷۔

ہونے والے افراد پر بھی ملت' اُمّت اور الجماعۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔

سوال (۲): جماعت کے لیے تو امیر کی ضرورت ہوتی ہے' تو امیر کے بغیر صرف مشترکہ اصولوں پر اشتراک و اجتماع کی بنیاد پر اہل سنت پر الجماعۃ کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب: اصولی اور نظریاتی جماعتوں کی اصل قیادت وہ افکار کرتے ہیں جن پر ان جماعتوں کی تشکیل ہوئی ہو۔ اُمّت مسلمہ کی اصل قیادت و ہدایت بھی قرآن و سنت کرتے ہیں اور عملاً حق شناس' حق پرست علماء دین ''الجماعۃ'' کے فکری راہنما اور غیر حکومتی امراء و حکام ہوتے ہیں۔ اولوالامر کا لفظ اپنے عموم کے لحاظ سے دونوں طبقوں کو شامل ہے' یعنی علماء و فقہاء کو بھی اور امراء و حکام کو بھی' اس لیے کہ نظامِ امر انہی دو طبقوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ (۱)

(۷) جماعت المسلمین کا صحیح مفہوم

حضرت خذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث رسول ؐ میں جماعت المسلمین اور اس کے امام کے التزام کا حکم دیا گیا ہے' جسے بعض حضرات ایک مخصوص جماعت کے التزام کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ جماعت المسلمین کے التزام کا صحیح مفہوم بھی واضح کر دیا جائے' تا کہ التزامِ جماعت پر تحریر کردہ اس مضمون میں کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔ پہلے حضرت خذیفہؓ کی پوری حدیث ملاحظہ کر لیجیے!

> ''خذیفہؓ فرماتے ہیں کہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے ''خیر'' کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور میں ''شر'' کے بارے میں زیادہ سوال کیا کرتا تھا' اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں یہ شر مجھ پہ نہ آ جائے۔ چنانچہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم لوگ جاہلیت اور شر کی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ یہ خیر ہمارے پاس لے آئے (ایمان و اسلام اور امن و امان) تو کیا اس خیر کے بعد شر دوبارہ آئے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں! آئے گا''۔ میں نے کہا اس شر کے بعد دوبارہ خیر آئے گی؟ فرمایا: ''ہاں! آئے گی' مگر اس میں گدلا پن ہوگا۔'' میں نے پوچھا یہ گدلا پن کیسا ہوگا؟ فرمایا: ''ایسے لوگ آئیں گے جو میری سنت کے خلاف قوم کی راہنمائی کریں گے۔ تو اُن میں اچھے کام بھی دیکھے گا اور بُرے کام بھی دیکھے گا۔'' میں نے کہا کیا اس قسم کی خیر کے بعد پھر شر آئے گا؟ فرمایا: '' ہاں! ایسا شر آئے گا کہ جہنم کے دروازوں پر بلانے والے بیٹھے

---

(۱) احکام القرآن' ص ۲۱۰' ج۲۔ وتفسیر ابن کثیر' سورۃ النساء ' آیت ۵۹۔ ومشکل الآثار' ص ۴۷۶' ج ۱

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 21 (1,1)

ہوں گے اور جو لوگ ان کی دعوت قبول کریں گے وہ ان کو جہنم میں پھینک دیں گے (یعنی ضلالت کی راہ پر لگا دیں گے)''۔ میں نے عرض کیا کہ ان کی کچھ صفات بیان کیجیے! فرمایا: ''وہ ہماری ہی قوم میں سے ہوں گے اور ہماری زبان بولیں گے''۔

قُلْتُ فَمَا تَاْمُرُنِیْ اِنْ اَدْرَکَنِیْ ذٰلِکَ؟ قَالَ : ((تَلْزَمُ جَمَاعَۃَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاِمَامَھُمْ)) قُلْتُ فَاِنْ لَمْ یَکُنْ لَھُمْ جَمَاعَۃٌ وَلَا اِمَامٌ؟ قَالَ: ((فَاعْتَزِلْ تِلْکَ الْفِرَقَ کُلَّھَا وَلَوْ اَنْ تَعَضَّ بِاَصْلِ شَجَرَۃٍ حَتّٰی یُدْرِکَکَ الْمَوْتُ وَاَنْتَ عَلٰی ذٰلِکَ))(۱)

''میں نے کہا کہ اگر یہ زمانہ مجھ پر آ گیا تو آپؐ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''مسلمانوں کی جماعت اور مسلمانوں کے امام کے ساتھ لگے رہو''۔ میں نے عرض کی کہ اگر مسلمانوں کی جماعت بھی نہ ہو اور ان کا کوئی امام بھی موجود نہ ہو تو پھر کیا کروں گا؟ آپؐ نے فرمایا: ''ان سارے فرقوں سے الگ ہو جاؤ اگرچہ تمہیں کسی درخت کی جڑوں کو دانتوں سے مضبوط پکڑنا پڑے (یعنی درخت کے نیچے لوگوں سے الگ زندگی گزارنی پڑے) یہاں تک کہ جب تم پر موت آئے تو تم اسی حالت پر ہو۔''

اِس حدیث میں جن ادوار کی پیشین گوئی کی گئی ہے شارحینِ حدیث نے ان کے تعین کی کوشش بھی کی ہے' لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے کسی کا نام لے کر یا سال بتا کر تعین نہیں کیا تو ہمارے لیے بھی خاموش رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ مگر حدیث میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اور دور نہیں آئیں گے۔ اُمّت پر کئی اچھے بُرے ادوار گزر چکے ہیں اور کئی اچھے بُرے ادوار اور آئیں گے' یہاں تک کہ نزولِ عیسیٰؑ کے بعد اِس دُنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ جیسا دَور دوبارہ آئے گا۔ اور قیامت سے قبل یہ دُنیا خیر سے بالکل خالی ہو جائے گی اور شرار الناس یعنی بدترین لوگوں پر قیامت آئے گی۔

ہمارے لیے اِس حدیث میں جو ہدایت ہے اس میں کوئی ابہام نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب بدعت وضلالت کے غلبے کا دَور آ جائے اور بدعتیوں کا ہر فرقہ' گروہ اور جماعت لوگوں کو اپنی طرف بلائے تو تم ان ائمۂ بدعت وضلالت میں کسی کی دعوت قبول نہ کرو' اس لیے کہ وہ اسلام کے نام پر ضلالت کی دعوت ہو گی' بلکہ مسلمانوں کی اس جماعت کے ساتھ لگے رہو اور

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الفتن' وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ۔

چمٹے رہو جو قرآن وسنت کا التزام کرنے والے امیر کی امارت پر مجتمع ہوں' چاہے وہ صلاحیت کے اعتبار سے اپنے وقت کا معیاری مسلمان ہو یا اس کے اندر کچھ خرابیاں بھی موجود ہوں' مگر جب تک اُس حکمران نے طاغوت کی شکل اختیار نہ کی ہو اور قرآن وسنت سے منحرف نہ ہوا ہو اُس وقت تک اسی کا التزام کرنا دین کا تقاضا ہوگا۔ لیکن اگر تم ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئے ہو کہ مسلمانوں کا اجتماعی نظام درہم برہم ہو گیا ہو اور قرآن وسنت کی بالادستی تسلیم کرنے والی کوئی حکومت موجود نہ ہو اور اس نظام کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنے والی ایسی دینی جماعت بھی موجود نہ ہو جو قرآن وسنت کا التزام کرتی ہو اور تم اپنے اندر تنہا حالات کا مقابلہ کرنے یا جماعت بنانے کی قوت بھی نہ پاتے ہو' بلکہ تمہارے اپنے دین و ایمان کو خطرہ درپیش ہو تو ایسے حالات میں اپنے ایمان کے بے بہا خزانے کے تحفظ کے لیے لوگوں سے الگ ہو کر کسی محفوظ جگہ میں بیٹھ کر زندگی کے باقی دن پورے کرنا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں اپنے دین کو بچانے کے لیے فرار من الفتن کی رخصت ہی نہیں بلکہ فضیلت بیان ہوئی ہے۔ (۱)

باقی رہی یہ بات کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کیا ایسے حالات موجود ہیں یا نہیں؟ تو اس کا فیصلہ وہ شخص خود اپنی فراست وبصیرت کی روشنی میں کرے گا کہ کیا میرے لیے اب خلوت گزینی کی رخصت ہے یا نہیں' یا کیا میرے اپنے تخصی دین وایمان کو کوئی خطرہ درپیش ہے یا نہیں؟ یہ ہے اس حدیث کا میرے فہم کے مطابق صحیح مفہوم۔

جماعت المسلمین کا لفظ اور بھی کئی احادیث میں آیا ہے اور ہر جگہ اس کے معنی ہیں ''مسلمانوں کی جماعت''۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

((فَاَمَّا الْحُيّضُ فَيَشْهَدْنَ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ وَدَعْوَتَهُمْ وَيَعْتَزِلْنَ مُصَلَّاهُمْ)) (۲)

''حائضہ عورتیں بھی مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ عیدگاہ میں حاضر ہو جائیں اور ان کی دعاؤں میں شرکت کریں' البتہ ان کی نماز پڑھنے کی جگہ سے الگ رہیں۔''

اس حدیث میں جماعت المسلمین سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نماز عید کے لیے جمع ہوئے ہوں۔ یعنی اس سے مراد نمازِ عید کا اجتماع ہے' کوئی مخصوص تنظیم مراد نہیں ہے۔ دراصل اُمّت

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الدین الفرار من الفتن

(۲) صحیح البخاری' کتاب العیدین۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms11-05.inp 8/22/2014 4:44 PM PAGE 22 (1,1)

مسلمہ اور جماعت المسلمین دونوں ہم معنی ہیں۔ اُمّت کے معنی ہیں جماعت اور مسلمہ کے معنی ہیں فرمانبردار‘ یعنی اللہ کی فرمانبردار جماعت۔ اور اس جماعت میں شامل ہونے والوں کا نام اللہ نے مسلمین رکھا ہے۔ دین اسلام کے ماننے والوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمین بھی کہا ہے‘ مؤمنین بھی کہا ہے‘ اُمّت مسلمہ بھی کہا ہے‘ اُمّت وسط بھی کہا ہے اور حزب اللہ بھی کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہی مسلمانوں کو جماعت المسلمین کہا ہے۔ یہ سارے نام اسمائے صفتی ہیں اور موصوف واحد کے اپنی صفات کے اعتبار سے کئی نام بھی ہو سکتے ہیں۔ جس طرح کہ مسلمانوں کے افراد و اشخاص اپنے ناموں کے تنوع کے باوجود جماعت المسلمین میں شامل ہیں۔ البتہ موہم شرک یا فرقہ وارانہ نام رکھنا جائز نہیں ہے اور قرآن سنت کے خلاف کوئی چیز دستور اور لائحہ عمل میں شامل کرنا بھی ممنوع ہے۔

(۸) دینی جماعتیں اہل سنت کی برادر تنظیمیں ہیں

دینی جماعتوں پر میرا تفصیلی اور تحقیقی مقالہ جو وفاقی شرعی عدالت کے سوال کے جواب میں لکھا گیا تھا‘ میری کتاب ”تفہیم المسائل“ حصہ اوّل میں شامل ہے اور اسی موضوع پر میرا ایک مضمون ”فاران“ میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس لیے اس مضمون میں تفصیل کی ضرورت تو نہیں ہے البتہ دو باتوں کا ذکر مختصراً ضروری ہے۔

(ا) آج پورے عالم اسلام میں اور ہمارے ملک پاکستان میں بھی ”الجماعۃ“ یعنی اقامت دین کا فرض انجام دینے والی اسلامی حکومت موجود نہیں ہے‘ بلکہ ایسی حکومتیں قائم ہیں جو عملاً لادین سیاست کے اصول پر کام کر رہی ہیں۔ تو کیا اس نظام کو بدلنے اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا اُمّت مسلمہ پر فرض ہے یا نہیں؟ اگر فرض نہیں ہے تو پھر طاغوت سے انکار‘ نہی عن المنکر اور جہاد سے متعلق آیات کا مفہوم کیا ہے؟ اور اگر فرض ہے‘ اور یقیناً فرض ہے‘ تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس فرض کی ادائیگی کے لیے انفرادی جدوجہد کافی ہے یا اس کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنا ضروری ہے؟ میرے خیال میں اس سوال کا جواب ہر ایک کو معلوم ہے کہ ایک نظام کو مٹانے اور اس کی جگہ اسلام کا اجتماعی نظام لانے کے لیے اجتماعی جدوجہد کا نظام قائم کرنا ضروری ہے اور اس اجتماعی جدوجہد کے نظام کو جماعت یا تنظیم کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے لہٰذا اقامت دین کی جدوجہد کے لیے دینی جماعتیں بنانا ضروری ہے۔ اس کے شرعی دلائل

اور جماعت سازی کی شرائط وحدود میرے محوّلہ بالا مقالے میں بیان کردی گئی ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ طریقہ کار‘ حکمت عملی‘ تدابیر‘ مصالح مرسلہ اور تنظیم وتربیت کے نظام میں تنوع اور اختلافِ آراء کی وجہ سے ایک ہی مقصد کے لیے ایک سے زائد دینی جماعتیں اور تنظیمیں بھی بنائی جاسکتی ہیں‘ لیکن جب سب کا مقصد اقامت دین اور نفاذِ شریعت ہو اور ان کے دستور‘ منشور‘ طریقہ کار اور سرگرمیوں میں قرآن وسنت اور اصول اہلِ سنت والجماعۃ کے خلاف کوئی چیز موجود نہ ہو تو ان دینی جماعتوں کی حیثیت اہل سنت کی ذیلی برادر تنظیموں کی ہوگی اور سب کی سب عالمی ’’الجماعۃ‘‘ یعنی اہل سنت والجماعۃ کی ذیلی شاخوں کی طرح باہمی تعاون وتناصر کے ساتھ اقامتِ دین کے لیے کام کریں گی‘ بشرطیکہ پارٹی اور جماعتی تعصب کے جراثیم سے یہ جماعتیں محفوظ ہوں۔ پارٹی تعصب سے مُراد یہ ہے کہ اپنی پارٹی کو عملاً معیارِ حق کا درجہ دے دیا جائے‘ جو اپنی پارٹی میں شامل ہو اُس کی غلط بات کی بھی تائید کی جائے اور جو دوسری پارٹیوں میں ہو تو اس کی اچھی بات کی بھی تردید کی جائے۔ اُمّت کو حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف میں تقسیم کرنا اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ دینی اور اسلامی تحریکیں اگر جسد واحد کے مختلف اعضاء کی طرح کام کریں گی تو ملی یک جہتی اور اُمّت کی وحدت کو اِن تحریکوں کی کثرت سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا‘ لیکن اگر ان کے درمیان حسد وبغض اور رقابت ومخاصمت پیدا ہوگئی تو پھر اچھے سے اچھا دستور ومنشور اور اعلیٰ وارفع نصب العین رکھنے کے باوجود ایسی جماعتیں اُمّت مسلمہ کے اتحاد کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں نسل‘ زبان‘ علاقائیت اور فرقہ واریت کی بنیاد پر جماعت سازی کی اجازت نہیں۔ وصلی اللّٰہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

امام محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی رحؒ

مولانا سید وصی مظہر ندوی

زندگی کے نت نئے مسائل کا حکم قرآن حکیم اور سنت نبویؐ سے معلوم کرنا انتہائی اہم فریضہ ہے۔ اگر اس فریضہ کو کما حقہٗ ادا نہ کیا جائے تو انسان اپنی متحرک اور رواں دواں زندگی کے لئے اسلام سے کیسے ہدایت حاصل کر سکے گا؟ دوسری طرف اگر صحیح نیت اور کافی علم کے بغیر کوئی شخص اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کرے گا تو خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔

خلافت راشدہ کے دَور تک فقہی احکام اور قانون سازی کا یہ کام مسلمانوں کی مجلس شوریٰ انجام دیتی تھی۔ لیکن خلافت راشدہ کے بعد بادشاہ اور ان کی مجالسِ شوریٰ کے ارکان وہ لوگ تھے جن کے علم اور تقویٰ پر عامۃ المسلمین کو اعتماد نہ تھا۔ لہٰذا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ مسلمان صحیح اور قابلِ اعتماد ہدایت نہ ملنے کے باعث زندگی کے مسائل میں کہیں اسلام سے رہنمائی حاصل کرنا چھوڑ ہی نہ دیں۔ ان حالات میں ہمارے علماء کرام آگے بڑھے' اُنہوں نے وقت کے اس چیلنج کو قبول کیا اور تمام نئے تمدنی مسائل کا جواب کتاب وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں دیا۔ ہمارے ان علماء میں چاروں ائمۂ فقہ اور ان کے شاگردوں کے نام بہت ممتاز ہیں۔ ان میں سے ایک ایک نے ''تدوینِ قانون'' کا اتنا عظیم الشان کام انجام دیا جو کام دورِ حاضر میں بڑی بڑی تحقیقی مجلسیں بھی انجام نہیں دے سکتیں۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے ایک ممتاز شاگرد امام محمد بن الحسن شیبانی رحمہ اللہ ہی کے کارنامے کو دیکھئے کہ انہوں نے تدوینِ فقہ کے سلسلہ میں تقریباً 27 ہزار قانونی مسائل کی علمی تحقیق کر کے ان کا جواب لکھا۔ امام محمدؒ کے والد حسن' شام کے گاؤں ہرستا کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے منتقل ہو کر واسط آ گئے۔ یہیں امام محمدؒ کی ولادت ۱۳۲ھ میں ہوئی۔ تعلیم کی تکمیل کوفہ جیسے علمی مرکز میں ہوئی' جہاں عربی زبان' حدیث' فقہ اور علمِ کلام کے بڑے بڑے علماء کے حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ امام محمدؒ کے علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنے والد

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms06-09.inp 8/22/2014 4:42 PM PAGE 1 (1,1)

حدیث اور فقہ کے حصول پر صرف کر دیئے۔

انہوں نے حدیث کا علم مشہور محدثین سے حاصل کیا۔ پھر امام ابوحنیفہؒ کے پاس دو سال تک رہے اور امام صاحب کی وفات کے بعد اُن کے شاگرد امام ابو یوسفؒ کے پاس فقہ حنفی کی تکمیل کی۔ تین سال سے زائد مدینہ منورہ میں امام مالکؒ کے پاس ان کی کتاب ''موطا'' پڑھی۔ بیس سال کی عمر میں اُن کا شمار خود اساتذہ میں ہونے لگا اور ان کا الگ حلقۂ درس قائم ہو گیا۔ تصنیف و تالیف میں اُن کا مرتبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ آج فقہ حنفی کا سارا علمی سرمایہ قریب قریب اُنہی کی تصانیف پر مشتمل ہے۔ ان کی تصانیف میں سے مبسوط' جامع صغیر' جامع کبیر' سیر صغیر' سیر کبیر کو تو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ صرف سیر کبیر کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ یہ کتاب ۶۰ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ ان مشہور تصانیف کے علاوہ کتاب الحج' زیادات' کیسانیات' رقیات' ہارونیات بھی اُن کی ممتاز تصانیف ہیں۔

اس عظیم الشان علمی کارنامے کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے ہارون الرشید کے قاضی کی حیثیت سے نظامِ عدل کے قیام میں بھی بڑی خدمات انجام دیں اور شاہی ملازمت کے باوجود اپنی علمی و فکری آزادی اور عدل میں غیر جانبداری کو مجروح نہ ہونے دیا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے ایک سیاسی مخالف سے جو عہد کیا تھا جب اس نے اس کو توڑنے کے لئے علماء سے فتویٰ لینا چاہا تو یہ امام محمدؒ ہی تھے جو خلیفہ کی ناراضگی کے باوجود عہد توڑنے کے جواز کا فتویٰ دینے پر راضی نہ ہوئے۔ اسی طرح خلیفہ نے ایک بار بنی تغلب کے عیسائی قبیلے کے خلاف اُن کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی' کیونکہ وہ بنی تغلب سے ناراض ہو گیا تھا۔ لیکن امام محمدؒ نے خلیفہ کے رو در رو ایسا فتویٰ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ بنی تغلب سے جو معاہدہ ہوا تھا' اگرچہ اس میں یہ شرط تھی کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں گے' مگر اس شرط کی خلاف ورزی خود خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوتی رہی' پھر بھی ان کا معاہدہ ان خلفاء نے نہ توڑا' تو اب کسی کو اس کے توڑنے کا حق کہاں سے پہنچ سکتا ہے۔

۵۸ سال کی مختصر عمر میں ان کا انتقال ۱۸۹ھ میں رقہ کے مقام پر ہوا ——— انا للہ وانا الیہ راجعون ——— اس دن نحو کے زبردست عالم کسائی کا بھی انتقال ہوا اور دونوں رقہ میں مدفون ہوئے۔ ہارون الرشید نے ان دونوں علماء کے دفن کے بعد کہا کہ افسوس آج میرے ہاتھوں فقہ اور نحو کو لحد میں اتار دیا گیا۔ رحمہ اللہ وادخلہ فی عبادہ الصالحین

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (23)

پاکستان (۲)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد بابر کو اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اسے سب سے پہلے راجپوتوں سے نبردآزما ہونا پڑا۔ ادھر مشرقی صوبوں میں افغان جمع ہو رہے تھے اور تخت دہلی واپس لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ بابر نے دونوں کو شکست دی' لیکن اس کے جانشین ہمایوں کی غفلت سے افغانوں کو پھر منظم ہونے کا موقع ملا اور شیر شاہ سوری کی قیادت میں وہ بہار اور بنگال پر قابض ہو گئے۔

شیر شاہ سوری نے پانچ چھ سال (1540ء تا1545ء) کے مختصر عرصے میں سارا شمالی ہندوستان زیرنگیں کرلیا اور نظم ونسق کے ہر شعبے میں اہم اور مفید اصلاحات کیں۔ پنجاب پر قبضہ کر کے شیر شاہ نے امن وامان قائم کیا اور گکھڑوں کی گوشمالی کی۔ جہلم سے بارہ میل کے فاصلے پر اُس نے قلعہ رہتاس تعمیر کیا' تاکہ سرحد کی حفاظت ہو اور گکھڑ قبیلے پر بھی نگرانی رکھی جاسکے۔ بنگال میں بغاوت کا فتنہ کھڑا ہوا تو شیر شاہ نے اسے محض کچلنے پر اکتفا نہ کیا' بلکہ ایسی انتظامی تبدیلیاں کیں کہ پھر وہاں بغاوت کرنا محال ہو گیا۔ اس بادشاہ نے گرینڈ ٹرنک روڈ (جی ٹی روڈ) تعمیر کرائی جو سنار گاؤں (مشرقی بنگال) کو جہلم سے ملاتی تھی۔ پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد ہمایوں ہندوستان لوٹ کر آیا تو شیر شاہ کے نااہل جانشینوں سے عنانِ حکومت چھیننے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی (1554ء)۔ دو سال بعد ہمایوں کا انتقال ہوا تو اکبر تیرہ سال کی عمر میں کلانور (ضلع گورداسپور) میں تخت نشین ہوا۔

اکبر کا پچاس سالہ دور

اکبر کا پچاس سالہ دورِ حکومت (1556ء ـ1605ء) پاکستان و ہند کی تاریخ کے ممتاز ترین ادوار میں ہے۔ افغانستان سے بنگال تک اور کشمیر سے اسیر گڑھ تک اکبر نے ایک مضبوط' منظم اور خوشحال سلطنت قائم کی۔ اکبر کے عہد میں شمال مغربی سرحد کافی عرصے تک خطرے میں رہی۔ اکبر کا

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ms-pakistan-1.inp 8/22/2014 4:47 PM PAGE 1 (1,1)

بھائی مرزا حکیم کابل کا خود مختار فرمانروا تھا۔ ہندوستان میں اکبر کے مخالفین کے اکسانے پر وہ پنجاب پر حملہ کر کے دہلی کے تخت پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ ماوراء النہر میں ازبک زور پکڑتے جا رہے تھے اور اُن کا سردار عبداللہ خان ہندوستان پر حملہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ایران میں صفویوں کی طاقت عروج پر تھی اور ان سے بھی خطرہ لگا رہتا تھا۔ سرحد کے جنگجو قبائل بھی ہر وقت شرارت اور بغاوت کے لیے تیار رہتے تھے۔ اکبر خود 1570ء اور پھر 1577ء میں پنجاب آیا اور بلوچ اور افغان قبائل کی گوشمالی کی گئی۔ 1579ء میں مرزا حکیم نے پنجاب پر باقاعدہ حملہ کیا' لیکن شکست کھائی۔ سرحد کے گوناگوں خطرات کے پیشِ نظر 1581ء میں اکبر خود لاہور آیا۔ یہیں سے وہ کابل گیا اور مرزا حکیم کو معاف کر کے اسے دوبارہ وہاں کا حاکم مقرر کیا۔

1585ء میں مرزا حکیم کی وفات سے سرحد کے معاملات اور پیچیدہ ہو گئے۔ اکبر پنجاب روانہ ہوا اور 1598ء تک لاہور میں مقیم رہ کر سرحدی قبائل میں روشنیہ تحریک کو دبایا۔ کشمیر اور سندھ فتح ہو کر مغلیہ سلطنت میں شامل ہوئے۔ قندھار پر حملہ کرنے کے حوصلے پست ہو گئے۔ لاہور میں بادشاہ کے دورانِ قیام میں یہاں کی رونق' آبادی' عمارات اور صنعت و حرفت میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اُسی زمانے میں عیسائیوں کے دو مشن آئے۔ اکبر ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور انہیں گرجا تعمیر کرنے اور عیسائیت کی تبلیغ کرنے کی اجازت دی۔ اکبر نے پنجاب کے نظم و نسق کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی۔ ستی کی رسم کی روک تھام اور ہندو بیواؤں کو دوبارہ شادی کی اجازت کے سلسلے میں احکام جاری کیے۔

جہانگیر (1605ء۔ 1627ء)

اکبر کے بیٹے جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد چند مناسب اور مقبولِ عام اصلاحات کا اعلان کیا۔ اُس نے عموماً اکبر کی پالیسی اور اُس کے نظامِ حکومت کو قائم رکھا۔ اُس کے سب سے بڑے بیٹے خسرو نے بغاوت کی اور لاہور کا رخ کیا' لیکن بالآخر شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ خسرو کو مالی امداد دینے کی پاداش میں سکھوں کے مذہبی پیشوا گورو ارجن دیو کو سزائے موت دی گئی۔ 1607ء میں جہانگیر راولپنڈی ہوتا ہوا کابل گیا اور وہاں سے واپسی پر لاہور میں قیام کیا۔ جہانگیر کو کشمیر بہت پسند تھا اور وہ کئی بار وہاں گیا۔ جہانگیر کا نظم و نسق شروع میں بہت اچھا تھا اور وہ خود ملکی معاملات میں دلچسپی لیتا تھا' لیکن رفتہ رفتہ اُس نے سلطنت کا کاروبار نور جہاں پر چھوڑ دیا۔

ملکہ نور جہاں نے اپنی لیاقت و قابلیت سے تمام کام سنبھال لیے' لیکن کچھ عرصے بعد جہانگیر کے سب سے لائق اور اولوالعزم بیٹے خرم (شاہجہاں) سے اُس کی ٹھن گئی۔ سلطنت کے ممتاز سپہ سالار مہابت خان سے بھی اُس کی نہ بن سکی۔ اس باہمی کشمکش کا انجام یہ ہوا کہ ایران نے قندھار پر قبضہ کر لیا اور جہانگیر کے عہد میں مغل اسے واپس نہ لے سکے' اور خود جہانگیر کو مہابت خان نے جہلم پر حراست میں

لے لیا، مگر نور جہاں نے اپنی فراست اور سیاست سے جہانگیر کو چھڑا لیا۔ جہانگیر کا انتقال پنجاب میں ہوا اور وہ لاہور میں مدفون ہے۔ اُس کے عہد میں لاہور کی رونق اور خوبصورتی میں نمایاں اضافہ ہوا۔

شاہجہاں (1627ء تا 1658ء)

نور جہاں کی مدد سے شہزادہ شہریار نے لاہور میں بادشاہت حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن شاہجہاں کا خسر (ممتاز محل کا باپ) آصف خان بھی لاہور میں موجود تھا۔ اس نے حالات پر پوری طرح قابو پا لیا اور تاج و تخت کو شاہجہاں کے لیے محفوظ کر دیا۔ جہانگیر کے زمانے میں نظم و نسق میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، شاہجہاں نے ان کو دور کیا۔ منصب داری نظام کی از سرِ نو تنظیم کر کے فوج کی طاقت اور استعداد میں اضافہ کیا۔ شاہجہاں لاہور اور کشمیر کئی بار آیا۔ لاہور کی کئی مشہور عمارات شاہجہاں اور اس کے گورنر وزیر خان کے ایماء سے تعمیر ہوئیں۔ اسی کے عہد میں راوی سے ایک نہر نکالی گئی جس کے پانی سے شالا مار باغ وغیرہ سیراب ہوتے تھے۔ شاہجہاں کو اپنے آبائی وطن ماوراء النہر (وسطی ایشیا) سے بڑی محبت تھی اور وہاں کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں کو دوبارہ فتح کرنے کا خواہش مند تھا۔ اُس نے کئی بڑی بڑی مہمیں بھیجیں، لیکن اُن کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ قندھار پر قبضہ ہو گیا۔ تاہم چند ہی سال میں ایرانیوں نے قندھار پھر واپس لے لیا۔ مغل پھر کبھی اسے حاصل نہ کر سکے اور شاہجہاں کی تمام کوششیں اور مہمیں ناکام رہیں۔

شاہجہاں کی بیماری (1657ء) میں اس کے بیٹوں میں تاج و تخت کے لیے جنگ چھڑی تو پنجاب بھی اس کی زد میں آیا۔ دارا شکوہ دہلی سے فرار ہو کر پنجاب آیا۔ سکھوں کے گورو ہر رائے نے اسے امداد دی، لیکن اورنگ زیب کے سپہ سالار اس کے تعاقب میں تھے۔ اورنگ زیب خود اس کے تعاقب میں لاہور اور ملتان آیا۔ دارا شکوہ لاہور، ملتان، بھکر اور مختلف مقامات پر بھاگا بھاگا پھرا، بالآخر سرحدی علاقے میں پکڑا گیا۔

اورنگزیب (1659ء۔ 1707ء)

اورنگ زیب عالمگیر کے تقریباً پچاس سالہ عہد میں دکن اور شمال مشرق میں مغل سرحد میں توسیع ہوئی۔ 1667ء میں سرحدی علاقے میں بڑی زور کی بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت کے قائدین میں خوشحال خان خٹک بھی شامل تھا، جو تلوار کا دھنی ہونے کے علاوہ پشتو کا مشہور شاعر بھی تھا۔ اورنگزیب کو خود اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے جانا پڑا۔ جب بغاوت کچل دی گئی تو اورنگ زیب نے قبائلیوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں سکھوں کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ 1675ء میں گورو تیغ بہادر کو بغاوت اور سرکشی کے الزام میں سزائے موت دی گئی۔ سکھوں میں اس اقدام سے بہت اضطراب پھیلا، اور مغل حکومت سے نفرت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ تیغ بہادر کے جانشین

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ma-pakistan-1.inp 8/22/2014 4:47 PM PAGE 2 (1,1)

گورو گوبند نے سکھوں کو امتیازی نشان دے کر اُن میں زبردست تعصب پیدا کیا اور اُن میں عسکری روح پھونک دی۔ سکھوں کی مذہبیت پر عسکریت غالب آ گئی۔ گورو گوبند نے اب باقاعدہ فوج رکھنا شروع کر دی اور چند قلعے بھی تعمیر کرائے۔ اورنگ زیب اس زمانے میں دکن میں مصروف تھا۔ اس کی غیر حاضری اور مصروفیت سے گورو گوبند نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اُس نے قرب و جوار کی ہندو ریاستوں پر حملے کرنے شروع کیے اور مغل افواج کو بھی زک پہنچائی۔ ان راجاؤں نے دربار دہلی سے امداد کی درخواست کی۔ اس بار سکھوں کے خلاف باقاعدہ فوج کشی کی گئی۔ سکھ افواج کو شکست ہوئی اور گورو گوبند بھیس بدل کر روپوش ہو گیا۔ اس شکست سے سکھوں کی طاقت کچھ دنوں کے لیے دب گئی' لیکن اُن کے فوجی اور قومی جذبے میں کوئی کمی نہ آئی۔

اورنگزیب کے بعد

1707ء میں اورنگ زیب نے وفات پائی۔ اپنی زندگی کے آخری 26 سال اس نے دکن میں گزارے تھے۔ اس طویل غیر حاضری کے باعث برعظیم کے شمال مغربی علاقوں (موجودہ پاکستان) کے نظم و نسق میں بڑی کمزوری پیدا ہو گئی تھی اور بغاوت پسند عناصر کو اُبھرنے کا موقع مل گیا۔ پھر بھی اورنگزیب کے نام کی دھاک قائم تھی اور مخالفین کھلم کھلا میدان میں آنے سے دبکتے تھے۔ اس کی وفات کے بعد سارے ملک میں انتشار پھیل گیا۔ انتشار پسند عناصر میں دو گروہ سب سے قوی ثابت ہوئے۔ اوّل سکھ' جنہوں نے پنجاب اور سرحد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوم مرہٹے' جنہوں نے مہاراشٹر سے نکل کر شمال میں پنجاب اور مشرق میں بنگال تک لوٹ مار مچا دی۔

1708ء میں بندہ بیراگی کی قیادت میں سکھوں نے لاہور کے مضافات میں قتل و غارت شروع کر دی۔ آٹھ نو ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا' لیکن بہادر شاہ (اوّل) نے ان حالات کی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ چار سال بعد اس کا انتقال ہوا تو رہی سہی آن بھی ختم ہو گئی۔ شاہی دربار امراء کے عزائم کی بازی گاہ بن گیا۔ وہ جسے چاہتے تخت پر بٹھاتے اور جب چاہتے اتار دیتے۔ فرخ سیر کے عہد میں سکھوں کی طاقت اور تنظیم بہت بڑھ گئی۔ مسلمان اور مسلمانوں کی مساجد اور مقابر ان کی توجہ کے خاص مرکز تھے۔ لاہور سے سرہند تک کوئی مقام محفوظ نہ تھا اور سکھ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ 1715ء میں پنجاب کے صوبیدار عبدالصمد خان نے سکھوں کو زبردست شکست دی۔ بندہ بیراگی گرفتار ہو کر مارا گیا اور سکھ کچھ عرصے کے لیے دب گئے۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے

اس افراتفری میں' جو ملک میں پھیل رہی تھی' سرحد کی حفاظت کی فکر کون کرتا! کابل کا صوبیدار آرام سے پشاور میں رہتا تھا۔ نادر شاہ نے حملہ کیا تو اس نے سارے راستے کھلے پائے۔ وہ لاہور آیا

اور وہاں کے صوبیدار زکریا خان کی اطاعت قبول کر کے دہلی جا پہنچا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ نے سندھ پار کے تمام علاقے، یعنی سندھ، کابل اور مغربی پنجاب نادر کے حوالے کر دیے۔ نادر کے حملے سے سارے ملک میں بے اطمینانی پھیل گئی۔ ان حالات میں سکھوں نے پھر لوٹ مار شروع کر دی، اور راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے کو کھنگال ڈالا۔ زکریا خان نے بڑی کوشش اور سختی سے انہیں کچلا اور ان کے قلعے مسمار کیے۔ 1747ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا۔ اسے اس حملے پر اکسانے میں جالندھر کے صوبیدار آدینہ بیگ کا ہاتھ تھا۔ ابدالی نے لاہور فتح کر کے وہاں اپنا صوبیدار مقرر کیا اور وہاں سے تیس لاکھ روپے اور بے شمار مالِ غنیمت لیتا ہوا دہلی چلا گیا۔ سرہند کے پاس وزیر قمر الدین کے بیٹے میر منو نے جم کر مقابلہ کیا اور درّانی فوج کو پسپا کر دیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر میر منو کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔

اس کے بعد احمد شاہ نے پنجاب پر سات حملے کیے۔ اس کے حملوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ پنجاب میں حکومت کا وقار بالکل ختم ہو گیا۔ پنجاب کی دولت سمٹ سمٹ کر افغان حملہ آوروں کے ساتھ چلی گئی اور سکھوں کو اپنی قوت بڑھانے اور لوٹ مار کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ کئی بار انہوں نے لاہور پر یورش کی۔ بعض مغل حکام نے بھی ابدالی کے راستے میں مشکلات پیدا کرنے کے لیے کئی بار سکھوں کو اکسایا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ابدالی اور اس کے سپہ سالاروں نے سکھوں کی سرکوبی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، لیکن ابدالی کے متواتر حملوں سے سکھوں کی طاقت کو فروغ بھی ہوا، اس لیے کہ ان حملوں سے جو افراتفری اور بے اطمینانی پھیلی، وہ سکھوں کو راس آئی۔ روہیلوں اور مالیر کوٹلہ کے افغانوں نے بھی خوب لوٹ مار مچائی۔ پنجاب میں پہلے ہی بدامنی اور انتشار کی کمی نہ تھی کہ اب ایک نیا خطرہ نمودار ہوا۔ آدینہ بیگ کے اشارے پر مرہٹوں نے پنجاب پر حملہ کیا اور ابدالی کے حکام کو شکست دے کر لاہور پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے سارے پنجاب سے ابدالی کے حکام کو مار بھگایا، لیکن کچھ عرصے کے بعد واپس چلے گئے۔

1765ء - 1766ء میں سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور جہلم سے ستلج تک کے سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے امن و امان قائم کیا اور مضبوطی سے حکومت کی۔ اگلے سال ابدالی نے آخری حملہ کیا۔ سکھ وقتی طور پر پسپا ہو گئے، لیکن اس کے جاتے ہی پھر نکل پڑے اور چند ہی سال میں وہ کانگڑہ اور جموں سے اٹک اور ملتان تک کے سارے علاقے پر غالب آ گئے۔ اس طرح پنجاب میں مغلوں اور افغانوں کی جنگ سکھوں کی فتح پر منتج ہوئی۔

پنجاب: مغلیہ عہد میں

مغلوں کے عروج کا زمانہ پنجاب کے لیے بڑا خوش آئند ثابت ہوا۔ زراعت کا فروغ ہوا،

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq september05\ma-pakistan-1.inp 8/22/2014 4:47 PM PAGE 3 (1,1)

تجارت اور صنعت کو ترقی ہوئی۔ لاہور اور ملتان کو مرکزی حیثیت حاصل تھی‘ اور یہ تجارت کی بڑی منڈی تھے۔ امن وامان اور عام خوشحالی کے باعث زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی رونما ہوئی۔ مغل بادشاہ اور ان کی متابعت میں مغل امراءعلم وادب اور فنونِ لطیفہ کے سرپرست تھے۔ شاہی دربار کی طرح ہر صوبیدار بلکہ ہر بڑے امیر کی بارگاہ کے ساتھ اہلِ علم‘ شعراء اور فن کار ضرور وابستہ ہوتے تھے۔ مصوری کو شاہی سرپرستی میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ مغل مصوری کے بعض اچھے نمونے لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔ علماء میں ملاّ عبداللہ سلطان پوری اور مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی‘ اور صوفیاء میں میاں میر اور ملا شاہ قادری کے نام ممتاز ہیں۔ مہابھارت‘ جوگ وششٹ‘ رامائن اور نل دمن کے فارسی تراجم کی تیاری میں پنجاب کے کئی فضلاء نے حصہ لیا۔ پنجابی زبان کی سب سے بلند پایہ نظم وارث شاہ کی ’’ہیر‘‘ بھی مغلوں کے آخری دور کی تخلیق ہے۔ لاہور اور ٹھٹھہ بڑے علمی مرکز تھے۔ ایک یورپی سیاح کا بیان ہے کہ ٹھٹھہ میں چار سو سے زیادہ دار العلوم تھے۔

سکھوں کا دورِ حکومت

سکھوں نے جب لاہور اور پنجاب پر قبضہ کیا تو وہ متعدد مثلوں میں بٹے ہوئے تھے‘ اور اُن میں باہمی رقابتیں اور مناقشے چلتے رہتے تھے۔ 1798ء میں ابدالی کے پوتے شاہ زمان نے پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کو رنجیت سنگھ کے سپرد کر کے وہ واپس چلا گیا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی انتظامی اور فوجی طاقت کا سکّہ جمایا اور سکھ سرداروں میں اسے ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس نے رفتہ رفتہ چھوٹی موٹی ریاستوں کو شامل کر کے اپنا علاقہ خاصا وسیع کر لیا‘ لیکن 1808ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اعلان کر دیا کہ ستلج کے بائیں جانب جتنا علاقہ ہے (علاوہ اس کے جس پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو چکا تھا) وہ کمپنی کے زیر حفاظت ہے۔ اس طرح رنجیت سنگھ کے لیے جنوب مشرق میں مزید توسیع کا راستہ بند ہو گیا۔ اب اس نے اپنی پوری توجہ مغرب کی سمت لگا دی۔ 1820ء تک ملتان‘ پشاور‘ ڈیرہ جات اور کشمیر فتح ہو کر اس کی ریاست میں داخل ہو چکے تھے۔ سکھوں نے پنجاب اور سرحد میں مسلمانوں پر جو مظالم کیے‘ ان کے ردّعمل میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی قیادت میں مسلمان مجاہدین نے ایک منظم مہم شروع کی اور سکھوں سے پشاور چھین لیا‘ لیکن بالاکوٹ کی لڑائی (1831ء) میں ان کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم ہوگئی۔

1839ء میں رنجیت سنگھ کے مرتے ہی سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس کے جانشین نالائق نکلے۔ سکھ فوج خودسر ہوگئی اور ستلج پار کر کے انگریزوں سے جا ٹکرائی۔ سکھوں کا یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا۔ 1849ء میں سکھ راج یکسر ختم ہو گیا اور موجودہ پاکستان کا خاصا بڑا اور زرخیز علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ (جاری ہے)